# مجلس ادارت



## سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری سنہ ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

**جلد ۱** اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپیے۔

**جلد ۲** اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف سنہ ۸۲ء سے لے کر ۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپیے

**جلد ۳** اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپیے۔

**جلد ۴** تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۳ روپیے۔

**جلد ۵** اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپیے۔

"منیجر"


جلد ۱۴۷　ماہ رجب المرجب سنہ ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۹۱ء　عدد ۲


# مضامین



## معارف کا زر تعاون


ہندوستان میں　فی شمارہ ۴ روپیے　سالانہ چندہ ۴۰ روپیے

پاکستان میں　سالانہ چندہ ۱۰۰ سو روپیے۔

پاکستان میں چندہ بھیجنے کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی۔ پاکستان

بیرونی ملکوں میں ہوائی ڈاک سے سالانہ چندہ ۱ پونڈ یا ۶ ڈالر۔

" " بحری ڈاک " " ۳ پونڈ یا ۵ ڈالر۔

# شذرات

عراق کی صدام اور کویت پر اس کے غاصبانہ قبضہ، عربوں کی نااہلی و ناعاقبت اندیشی اور امریکہ کے سخت رویہ اور مسلمانوں کو کچل دینے کی پالیسی نے عرب کی سرزمین کو اس وقت میدانِ کارزار میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں مانند آب مسلماں کا لہو ارزاں ہو گیا ہے، اور تثلیث کے فرزند کھلم کھلا میراث خلیلؑ میں دراندازی کر رہے ہیں، حالانکہ نبی آخر الزمان کا ارشاد ہے:

اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب (جزیرۂ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دو) اور قرآن مجید نے بھی ان سے عدم موالات کا حکم دیا ہے: لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ۔ مگر آپ کے پیروؤں اور خالص وارثوں نے ان کو اپنا حلیف بنا لیا ہے اور اب ان کا لشکر جزیرۃ العرب میں دندناتا پھر رہا ہے، اور مسلمانوں کے اہم اور مرکزی شہر ناگاساکی اور ہیروشیما بنتے جا رہے ہیں، یہ بحث فضول ہے کہ اس کا باعث عراق ہے یا سعودی عرب؟ حقیقت یہ ہے جس کی گواہی دونوں کا ضمیر ضرور دیتا ہو گا کہ دونوں خاک حجاز کو خشت بنیاد کلیسا بنانے میں برابر کے شریک ہیں۔

عربوں پر خدا کے احسانات گوناگوں ہیں، اس نے انھیں ایمان کی دولت دی: بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ۔ بنی اسرائیل کے بجائے ان کو اپنے فضل و شرف سے نوازا اور ان کو دنیا کی امامت و سیادت بخشی، ان کے اندر اپنا آخری رسول بھیجا، جس نے ان کو کفر و ضلالت سے نکالنے کے لیے خدا کی آیتیں پڑھ کر انھیں سنائیں، ان کے ذہن و دماغ سے باطل افکار و نظریات محو کر کے انھیں پاکیزہ و مطہر بنایا، ان کے جاہلی عادات و اخلاق مٹانے کے لیے انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی، وہ آپس میں لڑ بھڑ کر ہلاک و برباد ہو رہے تھے، مگر ہدایت ربانی نے ان کے دلوں میں الفت پیدا کر کے انھیں بھائی بھائی بنا دیا، چنانچہ غزوۂ حنین کے غنائم کی تقسیم کے بعد انصار کو کچھ شکایت ہوئی تو آپ نے ان سے



خطاب کر کے فرمایا: "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی، تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا، تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو دولتمند کیا"۔

ہر ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ "خدا اور رسولؐ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے"

خداوند قدوس نے عربوں کو ایک پرامن اور بابرکت شہر میں بسایا، ان کے معبد کو مامون و محترم اور لوگوں کی عقیدت کا مرجع بنایا، جس کے اردگرد چاروں طرف کیسی بدامنی پھیلی ہوئی تھی کہ لوگوں کو اپنے اچک لیے جانے کا اندیشہ رہتا تھا، لیکن خدا نے اس شہر اور اپنے گھر کو امن و آسائش کا گہوارہ بنا کر اس کی برکتوں کو دنیا کی زندگی میں مومن و کافر سب کے لیے عام کر دیا، روحانی برکتوں سے مالا مال کرنے کے علاوہ مادی آسائش اور رزق و معیشت کے تمام اسباب بھی مہیا فرمائے، خصوصاً اس صدی میں خدا نے ان کے لیے زمین کے جو خزانے کھول دیے ان سے آج پوری دنیا متمتع ہو رہی ہے، اور ہر ملک ان کا دست نگر بن گیا ہے، عربوں کی اس مادی خوشحالی اور فارغ البالی سے ساری دنیا دم بخود تھی لیکن یہودی و عیسائی ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں میں لگے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے عیش و فراغت کے باوجود ان کی زندگی نہایت تلخ اور ناک میں دم ہے

عربوں کی دولت نے انگریزوں کو حواس باختہ کر دیا، وہ گھبرا اٹھے کہ اس کے ساتھ اگر ان میں وحدت بھی پیدا ہو گئی تو ان کی قوت کو روکنا مشکل ہو جائے گا، تفرقہ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود ہے، ان کی ساحری نے عربوں کو چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے مستقل صف آرا کر رکھا ہے، مزید برآں انھوں نے اسرائیل کو بھی ان کے سر پر مسلط کر دیا ہے، عراق کی ابھرتی ہوئی قوت کو کمزور کرنے، عربوں میں آزادی و بیداری کی لہر کو روکنے اور سعودی عرب، کویت اور دوسرے مسلم ملکوں کو اپنے شکنجے میں جکڑنے کا جو منصو

بنایا گیا ہے، یہ جنگ اسی کی کڑی ہے، کاش عیش و تنعم کے خوگر اور دولت و ثروت کے متوالے
عرب اب ہوش میں آجائیں اور اپنے ازلی دشمنوں کو پہچان لیں، ان کے ہر مسئلے کا حل اسی میں
ہے کہ وہ اس تعلیم و ہدایت سے اپنے کو وابستہ کرلیں جو نبی عربی (علیہ الف الف تحیۃ) کے
ذریعہ انھیں ملی تھی۔

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل　　اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

آزادی کے بعد ہی سے ہندوستان نفرت، تشدد اور فرقہ واریت کی آگ میں جل
رہا ہے، اس کو بجھانے کی اب تک جو کوششیں کی گئیں ان کا نتیجہ الٹا نکلا

ع۔ الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

اس کے پیش نظر ۲۰/۲۱ جنوری کو ملی جمعیۃ علمائے ہند کے زیر اہتمام ایوان غالب نئی دہلی
میں ایک نیشنل کنونشن ہوا جس کی صدارت ملک کے مشہور سیکولر اور معمر رہنما بشمبر ناتھ پانڈے نے کی
اور پارلیمنٹ کے بہت سے ممبروں، مسلم جماعتوں کے نمایندوں اور مختلف مکتب فکر سے تعلق
رکھنے والے سرکردہ حضرات نے شرکت کی، کنونشن نے بڑھتی ہوئی فرقہ واریت پر گہری تشویش ظاہر کی
اور مفید تجویزوں کو منظور کرنے کے علاوہ ملی جمعیۃ کے جنرل سکریٹری اور سابق ممبر پارلیمنٹ مولانا
سید احمد ہاشمی کو سیکولر افراد پر مشتمل ایک سب کمیٹی کی تشکیل کا اختیار دیا جو آزادی کے بعد کی فرقہ وارانہ
صورت حال کا جائزہ لے کر مستقبل میں اس کو ختم کرنے کی تدبیریں کرے گی، الحمد للہ کمیٹی نے
کام شروع کردیا ہے، مولانا سید احمد ہاشمی کو ملی و قومی کاموں کا تجربہ ہے، اللہ تعالیٰ انھیں اس اہم اور ضروری
کام کو انجام دینے کی توفیق و ہمت دے، انھوں نے مجھے اس کا دعوت نامہ بھیج کر اپنے اخلاص و تعلق کا
ثبوت دیا، مگر میں شرکت کا موقع نہیں نکال سکا جس کا افسوس ہے۔

معارف نے علم و فن کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے، لیکن وہ برابر خسارہ سے شائع ہو رہا ہے
دوسرے رسالوں کے مقابلہ میں اس کا زر تعاون بہت کم ہے، اگر معارف کا ہر خریدار کم از کم ایک مزید
خریدار مہیا کردے تو بھی غنیمت ہے۔



# مقالات

## ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ

از
ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اسلام آباد، پاکستان

"ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ قرآنیات کے متبحر عالم اور علامہ شبلیؒ کے
ماموں زاد بھائی اور ان کے قابل فخر شاگرد تھے، ان کے فخر و امتیاز کے لیے یہی کافی
ہے کہ علامہ شبلیؒ ان کی کتابوں کی تلخیص خود کرکے الندوہ میں شائع کرتے تھے اور
معارف میں بھی ان کی کتابوں کی تلخیص چھپتی تھی، دارالمصنفین کی بنا و تاسیس میں مولانا
فراہیؒ کا نمایاں حصہ تھا، اور وہ مدۃ العمر اس کی مجلس عاملہ کے صدر رہے، مگر نہایت
افسوس ہے کہ ابھی تک ان کی کوئی مکمل سوانح عمری شائع نہیں ہوئی، ڈاکٹر شرف الدین
اصلاحی کو نومبر ۱۹۷۷ء میں ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کی جانب سے مولانا
فراہیؒ پر ایک ریسرچ پروجیکٹ تفویض کیا گیا تھا جس کی تکمیل میں وہ کئی برس سے
منہمک تھے، مگر ابھی وہ اس پروجیکٹ کا سوانحی حصہ ہی مکمل کرسکے تھے اور مولانا کے
علوم و افکار پر مواد تو اکٹھا کر چکے تھے مگر اس کی ترتیب و تسوید نہیں کرسکے تھے کہ ادارہ
سے ان کا تعلق منقطع ہوگیا اور یہ پروجیکٹ تعطل کا شکار ہوگیا۔

پروجیکٹ کا سوانحی حصہ فل اسکیپ سائز کے تقریباً ہزار صفحات پر مشتمل ہے، یہ مقالہ اسی کی تلخیص ہے، اختصار کی وجہ سے اس میں جو کمی نظر آئے اس کے لیے ناظرین کو اصل مقالہ کی اشاعت کا انتظار کرنا چاہیے، اگر سوانحی حصہ علمی خدمات و کارناموں کے ساتھ چھپ جائے تو مولانا کی سوانح عمری مکمل ہو جائے گی جس کا عرصہ سے انتظار ہے، قارئین کی تفہیم کی غرض سے راقم نے جا بجا توضیحی حواشی لکھ دیے ہیں۔" (معارف)

**نام** والدین کا رکھا ہوا اصل نام عبدالحمید ہے، اور یہی نام وہ آخر تک اپنی اہم تصانیف کے سرورق پر لکھتے رہے، نام کے ساتھ المعلم کا لفظ وہ از راہ تواضع و انکسار یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بُعثتُ معلّماً کے بموجب یا ارشاد نبویؐ خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ کے بمصداق اتباع سنت میں اپنایا تھا، چنانچہ ان کی سنجیدہ اور علمی و دینی تصانیف پر عبدالحمید کے ساتھ المعلم کا لفظ بھی ملتا ہے، الامام اور الاستاذ کے الفاظ ان کے تلامذہ اور عقیدت مندوں نے اظہار عقیدت کے لیے شامل کیے، حمیدالدین کو ہم ان کا عرفی نام کہہ سکتے ہیں، بعد میں وہ اسی نام سے مشہور ہوئے، یہ نام انھوں نے علامہ شبلیؒ کے ایما پر اختیار کیا جو ان کی افتاد طبع سے ہم آہنگ نہیں، سرکاری کاغذات وغیرہ اور خطوط میں ان کا یہی نام ملتا ہے، یہ کہنا کہ ان کے دو نام تھے[2] درست نہیں، لقب یا خطاب قسم کی کوئی چیز ان کے ناموں میں نہیں ملتی، البتہ نسبت "فراہی" ان کے نام کا لازمی جز ہی نہیں بلکہ بمنزلہ نام کے ہے اور متفق علیہ ہے،

لفظ فراہی کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ ان کے گاؤں پھریہا کی طرف نسبت ہے، لیکن لفظ پھریہا کے ساتھ اس کے اشتقاق کا رشتہ جوڑنا کسی قاعدے سے سمجھ میں نہیں آتا، میری تحقیق یہ ہے کہ یہ نسبت فراہ کی طرف ہے جو افغانستان کا ایک مقام یا صوبہ ہے، جہاں سے ترک سکونت کر کے مولانا کا خاندان ہندوستان آیا، اگرچہ اس امر کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملی، تاریخ میں



مولانا پہلے شخص نہیں ہیں جنھوں نے یہ نسبت اختیار کی، اور نہ یہ لفظ پھریہا کی تعریب ہے، جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے خیال ظاہر کیا ہے (ملاحظہ ہو یادرفتگان) اس کے ایک سے زیادہ شواہد موجود ہیں، اور قدیم تاریخ میں ایک سے زیادہ اشخاص کے نام اس نسبت کے ساتھ ملتے ہیں، لیکن یہاں صرف ایک حوالہ کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے جو شعر کی صورت میں ہے، اور شعر میں کسی لفظ کا تلفظ حتمی طور پر متعین ہوتا ہے ؎

ہمی گوید ابو نصر فراہی — بہ توفیق خداوند الٰہی

قدیم مطبوعہ کتاب نصاب الصبیان کا یہ پہلا شعر ہے، مولانا شاعر تھے، انھوں نے حمید کے ساتھ فراہی کو بھی بطور تخلص نظم کیا ہے (ملاحظہ ہو مطبوعہ فارسی دیوان)

**خاندانی حسب و نسب** خاندانی وجاہت مولانا کو ورثے میں ملی تھی، ان کا خاندان دیار کے شرفا میں شمار ہوتا تھا، جدی رئیس تھے، اجداد کا تعلق سرکار دربار سے بھی رہا، کئی پشت سے پیشۂ آبا زمینداری تھا، مولانا کے والد بڑے زمیندار تھے، دوسرے لوازم کے ساتھ سواری کے لیے گھر میں ہاتھی پلا ہوا تھا، مولانا کی ایک سگی پھوپھی علامہ شبلیؒ کی والدہ تھیں، مولانا کے دادا اور چچا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور وکیل تھے، ان کا اپنا ایک کتب خانہ تھا، جس سے علامہ شبلیؒ بھی وقتاً فوقتاً استفادہ کرتے تھے، نسباً مولانا انصاری تھے، شجرۂ نسب چند پشتوں سے آگے نہیں ملتا، لیکن انصار مدینہ کے ساتھ انصاری کی نسبت میں کوئی کلام نہیں، خاندان میں محفوظ شجرۂ نسب کے مطابق سلسلۂ نسب یوں ہے: حمیدالدین، عبدالکریم، قربان قنبر، تاج علی، قائم علی، دائم علی، شیخ بہاءالدین۔

خاندان کی نقل مکانی کے متعلق جو روایت ملتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ خاندان پانی پت سے جون پور، جون پور سے دونہ[1] اور وہاں سے پھریہا آکر آباد ہوا، پانی پت میں آمد سے قبل

---

[1] دونہ ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں کا نام ہے، سرکاری کاغذوں میں اس کا نام جہت مندپور ہے۔

کی کڑیاں مفقود ہیں، انصاری اور فراہی کی نسبتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ خاندان کسی زمانے میں مدینہ سے افغانستان آیا اور فراہ میں اقامت گزین ہوا۔

ددھیال کی طرح مولانا کی ننھیال بھی شرفاء میں تھی، اعظم گڈھ ہی کے ایک گاؤں مزارپور کو مولانا کی ننھیال ہونے کا شرف حاصل ہے، مولانا فراہی کی والدہ کا نام مقیمہ بی بی تھا، وہ کثیر الاولاد تھیں اور مولانا کے اپنے خاندان کی طرح ان کی والدہ کا خاندان بھی تعلیم یافتہ تھا۔

**تاریخ پیدائش وجائے پیدائش** مولانا فراہیؒ اپنے گاؤں پھریہا میں پیدا ہوئے جو بی۔این۔ڈبلیو آر چھوٹی لائن کا ایک ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور جس کا فاصلہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر سے سات میل اور اعظم گڈھ شہر سے بارہ ۱۲ میل ہے، ایک خاندانی دستاویز کے مطابق وہ ۶ر جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ کو بروز چہارشنبہ بوقت ۸ بجے صبح پیدا ہوئے، ۶ر جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ مطابق ہے ۱۸ر نومبر ۱۸۶۳ء کے، مولانا کے بعد حاجی مولوی رشید الدین[۱] صاحب پیدا ہوئے جو مولانا سے چھ برس چھوٹے تھے، مولانا کے کوئی بہن نہیں تھیں، بہن کے نام ایک مرثیہ سے بعض لوگوں کو دھوکا ہوا کہ مولانا کے کوئی بہن بھی تھیں، مولانا نے جس بہن کا مرثیہ لکھا ہے وہ ان کی پھوپھی زاد بہن تھیں، جن کو مولانا بہن سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

مولانا پیدا ہوئے تو ان کے والد اور والدہ دونوں زندہ تھے، وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھے، ان کے والد رئیس اور بڑے زمیندار تھے، اس لیے مولانا کا بچپن خوشحالی اور فارغ البالی میں گذرا، وہ طبعاً نیک اور شریف تھے، عام بچوں کی طرح کبھی کھیل کود میں حصہ نہیں لیا، بدی اور شرارت سے ہمیشہ دور رہے، بچپن میں مولانا کو قصص الانبیاء

---

۱ یہ مولانا کی وفات کے بعد مدرستہ الاصلاح کے ناظم ہوئے، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ و عاملہ کے بھی رکن تھے، اکتوبر ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا۔



جیسی کتابوں سے دلچسپی تھی، وہ اپنی پھوپھی کو یہ کتاب پڑھ کر سنایا کرتے تھے، اس کتاب کا اثر ان کی آئندہ زندگی پر پڑا۔

**تعلیم** مولانا کی ابتدائی تعلیم دیار کے رئیس شرفاء کی طرح گھر پر ہوئی، اس کا آغاز دستور کے مطابق ناظرہ اور حفظ قرآن سے ہوا، راجہ پور[۱] سکرور کے حافظ احمد علی مرحوم نے گھر پر رہ کر حفظ کرایا، دس برس کی عمر میں یعنی ۱۸۷۳ء میں یہ مرحلہ طے کر لیا، ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں: "وحفظت القرآن المجید وانا ابن عشرة سنين او بقرب منها"۔ اس کے بعد فارسی مولانا محمد مہدی چاروی[۲] سے پڑھی، فارسی کی تحصیل نو ماہ میں مکمل کر لی، مولانا کا اپنا بیان ہے:

"وتعلمت اللغة الفارسية فی مدة تسعة اشهر"۔

(الضیاء) یہ ۱۸۷۴ء کا واقعہ ہے، علامہ شبلیؒ اور ان کے استاد مولانا فاروق چریاکوٹیؒ کی صحبتوں سے فارسی کے ذوق کو جلا ملی، اور اس میں پختگی آئی، ۱۸۷۵ء، ۱۸۷۶ء کے دو سال بیماری میں گذرے۔

عربی زبان وادب کی تحصیل کا آغاز ۱۸۷۷ء میں ہوا، مولانا پھریہا سے اعظم گڈھ شہر آگئے اور علامہ شبلیؒ سے درس نظامی کی کتابیں پڑھیں، مولانا لکھتے ہیں: "میں نے ۱۴ برس کی عمر میں عربی زبان پڑھنا شروع کیا اور درس نظامی کی اکثر کتابیں اپنے پھوپھی زاد بھائی علامہ شبلیؒ سے پڑھیں"۔ (الضیاء) ۱۶ برس کی عمر میں (۱۸۷۹ء) فارسی کے سب سے مشکل گو شاعر خاقانی شروانی کے تتبع میں وہ قصیدہ لکھا جس کو دیکھ کر فارسی کے بڑے بڑے

---

۱ یہ اعظم گڈھ کا مشہور گاؤں اور مدرستہ الاصلاح سرائے میر کے قریب ہی شمال میں واقع ہے۔

۲ چارہ بھی اعظم گڈھ کا ایک ممتاز گاؤں ہے، جس کی طرف یہ نسبت ہے۔

اساتذہ دھوکا کھا گئے، یہ قصیدہ مولانا کے مطبوعہ فارسی دیوان میں شامل ہے، دیوان میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ قصیدہ ۱۲۹۶ھ میں لکھا گیا، قصیدہ کا مطلع ہے :

بے جلوہ رخ تو بود مضطر آئینہ     خار افگند بہ پیرہن از جوہر آئینہ

عربی اور اسلامی علوم کی تحصیل میں مولانا کب تک اعظم گڈھ میں مقیم رہے اس سلسلے میں کوئی روایت یا شہادت دستیاب نہیں، اعظم گڈھ سے علی گڑھ کے لیے علامہ شبلیؒ کی روانگی سے اپنا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دور ۱۸۸۳ء سے بہت پہلے تمام ہو چکا تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے لکھنے کے مطابق ۱۸۸۳ء میں مولانا فراہیؒ نے عربی اور اسلامی علوم کی تعلیم مکمل کر لی جبکہ ان کی عمر بیس[2] برس تھی (یاد رفتگاں) روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اعظم گڈھ میں علامہ شبلی سے کسب فیض کرنے کے بعد علم کے چشمۂ حیواں کی تلاش میں مولانا گھر سے باہر نکلے، کچھ وقت فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ سے استفادہ کیا جس کا ذکر مولانا نے خود بھی کیا ہے۔ (الضیاء)

رسمی تعلیم کے دور اول کا آخری مرحلہ مولانا فراہی نے لاہور جا کر طے کیا، مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور نجی طور پر عربی ادب کی تکمیل کی، یہ ۱۳۰۰ھ ۱۸۸۳ء کے قریب کی بات ہے، زندگی کے اس دور میں تعلیم کی مشقت کے ساتھ مشق سخن کا سراغ ان کے مطبوعہ دیوان فارسی سے ملتا ہے، جس کی ابتداء ۱۶ برس کی عمر میں ہو چکی تھی۔

**شادی** ۱۷ ار رجب ۱۲۹۰ھ مطابق ۴ رجون ۱۸۸۲ء کو ۱۹ برس کی عمر میں مولانا کی شادی ہوئی، اس کا علم مولانا کے فارسی کے استاد مولوی محمد مہدی چاردی کے لکھے ہوئے سہرے سے ہوتا ہے، یہ شادی بندول[1] میں علامہ شبلی کی سگی بہن مریم بی بی کی بیٹی سائرہ بی بی

[1] علامہ شبلیؒ کا مولد و وطن۔



سے ہوئی۔

**تعلیم کا دوسرا دور** فارسی، عربی اور دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا نے جدید تعلیم کی طرف توجہ کی اور الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لی، تعلیم کا یہ دوسرا دور ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۵ء تک ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :

مولانا نے ۸۳-۱۸۸۲ء تک عربی تعلیم مکمل کر لی تھی، اس کے بعد مولانا کے اپنے خود نوشت حالات میں ہے کہ وہ بیماریوں کا شکار رہے، اس کے بعد انگریزی زبان اور مروجہ مضامین کی پڑھائی شروع کی (الضیاء) مولانا سید سلیمان ندوی اور شیخ[1] صاحب مرحوم کے بیان کے مطابق مولانا پہلے مڈل اور پھر کرنل گنج اسکول الٰہ آباد سے نجی طور پر انٹر پاس کر کے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے، ۱۹ ر مئی ۱۸۹۱ء کو مولانا نے علی گڑھ کالج کے سال اول میں داخلہ لیا، اس وقت سر سید مرحوم زندہ تھے، اور علامہ شبلیؒ بحیثیت استاد کالج سے منسلک تھے، مولانا فراہیؒ کو عربی فارسی کے مضامین سے مستثنیٰ رکھا گیا، علی گڑھ کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو میرٹ اسکالرشپ ملتا تھا، داخلے کے دو سال بعد ۱۸۹۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے سکنڈ ڈویژن میں انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا، اس سال فرسٹ ڈویژن میں کوئی طالب علم پاس نہیں ہوا، مولوی عبد الحق[2] اور مولانا شوکت علی نے بھی اسی سال یہ امتحان پاس کیا، دو سال بعد ۱۸۹۵ء میں مولانا نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا، الہ آباد یونیورسٹی کیلنڈر کے مطابق مولانا نے یہ امتحان سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا (کیلنڈر ۱۹۰۶ - ۱۹۰۷)

بحیثیت طالب علم علی گڑھ میں قیام کے زمانہ میں مولانا فراہیؒ نے بعض علمی کام کیے

[1] مولانا فراہی کے صاحبزادے۔ [2] بابائے اردو۔

جسے ان کی آیندہ علمی زندگی کا پیش خیمہ کہا جا سکتا ہے، مولانا نے سرسید مرحوم کی فرمائش پر امام غزالی کی ایک کرم خوردہ کتاب کے قلمی نسخے کی ایڈیٹنگ کی، جبکہ کتاب کا کوئی دوسرا نسخہ ان کے سامنے نہیں تھا، اور یہ ایڈیٹنگ محض انھوں نے اپنے علمی ذوق اور عربی دانی کی مدد سے کی اور بالکل صحیح کی، جسے دیکھ کر سرسید کو حیرت ہوئی، اسی زمانے میں انھوں نے سیرت نبویؐ پر علامہ شبلی کے عربی رسالہ "تاریخ بدأ الاسلام" کا فارسی ترجمہ کیا، اور طبقات ابن سعد کے ایک جز کو بھی عربی سے فارسی میں منتقل کیا، یہ دونوں کتابیں چھپ کر کالج کے نصاب میں داخل ہوئیں، ایسی مثال کم ہوگی کہ مولانا جس کالج کے طالبعلم تھے اسی میں ان کی دو کتابیں داخل نصاب تھیں، یہ کتابیں راقم کی نظر سے گذری ہیں اور ان پر میرا ایک مفصل مضمون فکر و نظر اسلام آباد بابت جون ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا ہے، سرسید مرحوم کی تفسیر کے عربی یا انگریزی ترجمے کا قصہ بھی اسی دور سے تعلق رکھتا ہے، انھوں نے پہلے علامہ شبلیؒ سے پھر مولانا فراہیؒ سے اس کی فرمائش کی، لیکن دونوں نے معذرت کر دی، واقعے کی حد تک اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا، البتہ انداز گفتگو میں اختلاف کی گنجائش ہے۔

زمانۂ طالب علمی میں مولانا فراہی کالج کی انجمن لجنۃ الادب اور اخوان الصفا کے رکن رہے، جنوری ۱۸۹۴ء میں علامہ شبلیؒ کو شمس العلماء کا خطاب ملا تو مولانا فراہیؒ نے ان انجمنوں کی طرف سے منعقد کیے گئے جلسے میں عربی کا قصیدۂ تہنیت پڑھا، جو کئی بار شائع ہو چکا ہے، یہ قصیدہ عربی میں مولانا کی پہلی تحریر کہی جا سکتی ہے، اسی موقع پر مولانا نے ایک اور قصیدہ بھی لکھا جو کہیں شائع نہیں ہوا، میں نے اسے کتاب میں درج کر دیا ہے، اس وقت مولانا کی عمر تیس ۳۰ سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی، مولانا فراہیؒ کی زندگی



میں تدبر فی القرآن کا آغاز بھی اسی وقت ہوا جب وہ علی گڈھ میں کالج کے طالب علم تھے (دیباچہ تفاسیر فراہی)، اور فکر قرآن میں ان کا جو خاص منہج ہے اس کی ابتدا یہیں ہوئی۔ نفیاً یا اثباتاً۔ اس کے محرکات کا سراغ بھی علی گڈھ میں لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اسکے نتائج عملی شکل میں بہت بعد میں ظاہر ہوئے۔

بی اے کے بعد مولانا ایم اے عربی کا ارادہ رکھتے تھے مگر یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے ناپسندیدگی کے باوجود ایل ایل بی کی تیاری بھی شروع کی جس کا ذکر انھوں نے خود کیا ہے (الضیاء) لیکن اس میں دو سال صرف کرنے کے باوجود انھوں نے ایل ایل بی کا امتحان نہیں دیا۔ اس طرح نئی مغربی تعلیم کا یہ دور ۱۸۹۷ء میں ختم ہوتا ہے۔

**آغاز و سلسلۂ ملازمت**

مولانا گھر کے کھاتے پیتے تھے۔ ان کے والد دیار کے رئیس اور بڑے زمیندار تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ زر زمین کے جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے ان جیسے عالم فاضل کی افتاد طبع بھی اس سے میل نہ کھاتی تھی اس لیے انھوں نے معاش کے لیے ملازمت کا رخ کیا۔ لیکن ملازمت کی اپنی مکروہات ہیں۔ جن کا اندازہ پہلے بھی رہا ہوگا۔ تجربہ بعد میں ہوا معاملہ "اہون البلیتین" کا تھا۔

**کراچی ۱۸۹۷ء تا ۱۹۰۶ء**

پہلی ملازمت سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی میں کی جو اب ایس ایم کالج ہے۔ "سندھ مدرسہ" علی گڈھ کالج کا مصغر تھا۔ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۶ء تک مولانا یہاں رہے۔ یہاں مولانا چھٹی ساتویں جماعتوں کو عربی فارسی پڑھاتے تھے۔ انکی تنخواہ ستر روپیے ماہوار تھی۔ سندھ مدرسہ بورڈ کی ایک سالانہ رپورٹ کے مطابق یکم جون ۱۸۹۷ء کو مولانا نے عربی ٹیچر کی حیثیت سے یہاں کی ملازمت شروع کی۔

۱۸۹۹ء کے لگ بھگ کراچی میں مولانا کے یہاں تیسرے اور آخری بیٹے کی پیدائش

ہوئی جن کا نام عباد رکھا گیا۔ دو بیٹوں حماد اور سجاد کی پیدائش کراچی آنے سے پہلے ہو چکی تھی۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ کراچی میں ان کے بڑے بیٹے حماد کا انتقال ہوا اور وہ یہیں دفن ہوئے۔ علامہ شبلیؒ کی شہادت کے مطابق یہاں قیام کے زمانہ میں پہلی مرتبہ فارسی کا کچھ کلام شایع ہوا۔ (مکاتیب شبلی) یہ واقعہ ۱۹۰۰ء کا ہے۔ کراچی کی آب و ہوا اور یہاں کے ماحول سے مولانا کو شکایت تھی جو فطری تھی۔ اس کا اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے جو ابھی شایع نہیں ہوئے۔ ملازمت کے ساتھ مولانا نے علمی مشاغل کو جاری رکھا جس میں شعر و شاعری اور تفسیر نگاری دونوں شامل ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں انھوں نے عربی میں کوئی مضمون لکھا جس پر مولانا شبلیؒ نے اظہار نکیر کیا۔ (مکاتیب شبلی)

۱۹۰۳ء میں دیوان حمید شایع ہوا جس میں فارسی کلام کے علاوہ کچھ عربی کلام بھی شامل ہے۔ اس دیوان کے ساتھ عنفوان شباب کی ایک تصویر بھی شایع ہوئی تھی جو اب نایاب ہے۔ ۱۹۰۳ء میں پہلی بار مولانا کی تفسیر نظام القرآن کا ذکر علامہ شبلیؒ کے ایک خط میں آیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے تفسیر لکھنے کا کام باقاعدہ شروع کر دیا تھا۔ قیام کراچی کے دس سالہ دور میں مصر اور بیروت سے کتابوں کی خریداری کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ ۱۹۰۳ء کے ایک بل کی رقم ۱۵۵ روپیہ ہے۔ خیال رہے کہ کراچی میں مولانا کی تنخواہ ۱۰۰ سو روپیے تھی۔ اس بل میں جن کتابوں کے نام درج ہیں ان سے مولانا کے علمی ذوق اور معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا نے لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے ترجمان کی حیثیت سے خلیج کے ممالک کا دورہ کیا اور اسی سال کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے جائداد کے ایک مقدمہ میں ثالث بن کر اپنے والد کے خلاف فیصلہ دے دیا جس کے نتیجے میں جائداد کا ایک بڑا حصہ انکے ہاتھ سے نکل گیا جو بالآخر مولانا ہی کو ملتا۔ تفسیر



سورۂ ابی لہب اور جمہرۃ البلاغۃ مکمل کی اور مسودہ علامہ شبلیؒ کو بھیجا۔ انھوں نے الندوہ میں نظام القرآن اور جمہرۃ پر تقریظ و تبصرہ لکھ کر شایع کیا (الندوہ دسمبر ۱۹۰۵ء) ۱۹۰۶ء میں مولانا نے تفسیر سورۂ والشمس لکھی (مکاتیب شبلی) ۱۹۰۶ء ہی میں تفسیر سورۂ قیامہ مکمل ہوئی۔ اسی زمانے میں اقسام القرآن کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس کا خلاصہ علامہ شبلیؒ نے اپریل ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں شایع کیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوری ۱۹۰۷ء کی آخری تاریخوں میں مولانا نے کراچی کو خیرباد کہا۔

**علی گڈھ ۱۹۰۷ء تا ۱۹۰۸ء**

یکم فروری ۱۹۰۷ء کو مولانا نے ایم اے او کالج علی گڈھ کے شعبۂ عربی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت شروع کی اور یہ سلسلہ مئی ۱۹۰۸ء تک جاری رہا۔ علی گڈھ میں مولانا کی تنخواہ ۲۰۰ دو سو روپیے ماہوار تھی۔ مولانا طلبہ کے علاوہ صدر شعبہ یوسف ہاروویز کو بھی عربی پڑھاتے تھے۔ یوسف ہاروویز یہودی تھے۔ مولانا نے ان سے عبرانی پڑھی اور مختصر مدت میں اتنی صلاحیت بہم پہنچائی کہ عبرانی کتابوں سے براہ راست استفادہ کرنے لگے۔ مولانا کے علمی مشاغل بدستور علی گڈھ میں بھی جاری رہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے قیام علی گڈھ کے دوران اقسام القرآن لکھنے کا ذکر کیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اس رسالے کا خلاصہ علامہ شبلیؒ نے اپریل ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں شایع کیا (یاد رفتگاں) لیکن پہلے گزر چکا ہے کہ وہ جنوری ۱۹۰۷ء تک کراچی میں رہے اس لیے اقسام القرآن کی تالیف کراچی میں ہوئی نہ کہ علی گڈھ میں۔ واضح رہے کہ قرآن کی قسموں پر مولانا کے دو رسالے ہیں ایک کا نام اقسام القرآن ہے جو بہت مختصر ہے اور دوسرے کا نام امعان فی اقسام القرآن ہے۔ جو قدرے مبسوط ہے اور بعد کی تصنیف ہے۔ سجاد صاحب کے بیان کے مطابق قیام علی گڈھ ہی کے زمانے میں مولانا نے عربی نحو

وصرف پر دو رسالے لکھے ابتداً اس کا مقصد اپنے بچوں کو عربی پڑھانا تھا۔ لیکن بعد میں وہ مرتب ہو کر کتابی صورت میں شایع ہوئے۔ اسی لیے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان رسالوں کا تعلق قیام حیدرآباد سے بتایا ہے۔ قیام علی گڈھ ہی کے زمانے میں مولانا نے علامہ شبلیؒ کی دعوت پر ندوہ جا کر ایک ماہ قیام کیا اور علوم جدیدہ کی ایک کتاب دروس الاولیہ کا درس دیا (الندوہ نومبر ۱۹۰۷ء) اسی زمانے میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن ہوئے۔ ۳۱ مئی ۱۹۰۸ء کو مولانا نے علی گڈھ کو خیرباد کہا، چھ ماہ کی چھٹی لے کر وہ میور کالج الٰہ آباد چلے آئے اور پھر واپس علی گڈھ نہیں گئے۔ چھ ماہ کی چھٹی ختم ہونے کے بعد استعفاء بھیج دیا ہوگا۔

**الٰہ آباد ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۴ء** سنٹرل میور کالج الٰہ آباد کے شعبہ عربی میں ایک پروفیسر کے ریٹائرمنٹ پر جو جگہ خالی ہوئی اسے مولانا فراہی نے پہلے تو عارضی طور پر اور بعد میں مستقل طور پر پُر کیا۔ یکم جون ۱۹۰۸ء کو مولانا نے میور کالج میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ مولانا کی تنخواہ الٰہ آباد میں وہی دو سو روپیے رہی جو علی گڈھ میں تھی۔ یہاں مولانا ۱۹۱۴ء تک تقریباً ۶ سال رہے۔ منصبی فرائض کی ادائگی سے جو وقت بچتا تھا اس کو حسب معمول لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ خاص کر تفسیر نظام القرآن اور قرآن سے متعلق دوسری کتابوں کے لکھنے کا کام جاری رہا۔ سید صاحب کے بیان کے مطابق یہیں سے انھوں نے تفسیر سورۂ تحریم شایع کی اور یہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے مواعظ کا عبرانی سے فارسی نظم میں ترجمہ کیا جو بعد میں خرد نامہ کے نام سے شایع ہوا۔ قیام الٰہ آباد کے زمانے ہی میں مصر کے ایک عالم علامہ رشید رضا کو مولانا کی چند مطبوعہ کتابیں بھیجی گئیں۔ مارچ ۱۹۰۹ء کے المنار میں رشید رضا صاحب نے ایک تقریظ لکھی جس میں مصنف کو



بہت داد دی۔ قیام الٰہ آباد کے زمانے میں مولانا کے والد حاجی عبدالکریم صاحب کا انتقال ہوا۔ سجاد صاحب کے بیان کے مطابق ۱۹۱۰ء۔ ۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال پھریہا میں ہوا۔ انتقال سے پہلے مولانا چھٹی لے کر گھر آ گئے تھے۔ قیام الٰہ آباد کے زمانے میں مولانا "مشرقی علوم کی عربی کمیٹی" کے رکن مقرر ہوئے۔ بسلسلۂ ملازمت الٰہ آباد میں قیام کی کل مدت تقریباً ۶ سال ہے۔

۱۹۱۳ء کا ذکر ہے مولانا کے ہاتھ کسی انگریز نے اسلام قبول کیا (مکاتیب شبلی)

۱۹۱۳ء میں مدینہ میں بین الاقوامی یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز ہوئی تو پڑھانے کے لیے جن علماء کا نام تجویز ہوا ان میں علامہ شبلیؒ اور مولانا فراہیؒ کے نام بھی تھے۔ اسی سال کا واقعہ ہے۔ ریاست بھوپال میں انگریزی ترجمۂ قرآن پر حاشیہ لکھنے کی تجویز زیر غور آئی تو اس مشکل کام کے لیے مولانا کا نام تجویز ہوا۔ قیام الٰہ آباد کے دوران ہی حیدرآباد جانے کے لیے سلسلۂ جنبانی شروع ہو چکی تھی جس کا مفصل حال علامہ شبلیؒ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی منٹس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۳ء میں مولانا اس سال کے لیے عربی فارسی ایم اے پریوس کے ممتحن تھے۔ ۱۹۱۴ء کے منٹس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی فارسی اردو اور ہندی کے بورڈ آف ایگزامینرس کے رکن رہے۔ یوپی گورنمنٹ کے شعبۂ تقرر کی طرف سے ۶ جون ۱۹۱۴ء کو جو چھٹی جاری ہوئی اس کے مطابق مولانا کی خدمات دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی کے لیے حیدرآباد کے حوالہ کی گئیں۔ ۱۹۱۴ء کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے اپنے بڑے بیٹے سجاد صاحب کی شادی کی۔

**حیدرآباد دکن۔ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء** مولانا فراہی نے دارالعلوم حیدرآباد دکن کے پرنسپل کی حیثیت سے ۱۵۔ امرداد ۱۳۲۳ ف مطابق ۳۰ جون ۱۹۱۴ء سے اپنی ملازمت کا

آغاز کیا۔ مولانا ریاست کے مستعار الخدمت ملازم تھے۔ یوپی گورنمنٹ میں ان کی ملازمت برقرار تھی۔ الٰہ آباد میں یا اس سے پہلے کی ملازمتوں میں تنخواہ فکس (جامد) تھی یہاں ان کو سالانہ اضافہ کے ساتھ باقاعدہ اسکیل دیا گیا جو ۵۰۰ سے شروع ہو کر ۵۰ روپیے سالانہ اضافے کے بعد ۱۰۰۰ روپیے پر ختم ہوتا ہے۔ کالج میں مولانا انتظامی امور کی نگرانی کے علاوہ اونچی جماعتوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ حیدرآباد میں ریاستی سیاست کے علاوہ کالج کی اپنی اندرونی سیاست بھی تھی جس میں مولانا کے حصہ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس کے ناخوشگوار اثرات سے خود کو بچانا ناممکن تھا۔ مولانا کو حیدرآباد پہنچے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ان کے استاذ، مربی اور پھوپھی زاد بھائی علامہ شبلیؒ نے وفات پائی۔ وفات سے دو دن پہلے مولانا اعظم گڈھ پہنچ گئے تھے۔ ان کے علمی کاموں کو جاری رکھنے کے لیے جماعت نعمانیہ یا اخوان الصفا کے نام سے ایک حلقہ قائم کیا۔ اور جب اس مجلس نے دارالمصنفین کے قیام کی تجویز کو عملی شکل دی تو مولانا اس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

حیدرآباد میں مولانا کا تقرر ابتداً چھ ماہ کے پروبیشن پر ہوا تھا جب یہ مدت پوری ہوئی تو دسمبر ۱۹۱۴ء میں آزمائشی مدت ختم ہونے کے بعد ان کو مستقل کر دیا گیا۔ حیدرآباد میں مولانا نے سواری کے لیے گھوڑا گاڑی خریدی۔ دسمبر ۱۹۱۴ء میں مولانا کتب خانۂ آصفیہ کی مجلس انتظامی کے رکن بنے۔ ۱۹۱۵ء میں کمیٹی امتحانات السنۂ شرقیہ کے صدر مقرر ہوئے۔ اسی سال مولانا نے طلبہ کی انجمن ثمرۃ الادب کا احیاء کیا اور اپنی صدارت میں اس کو فعال بنایا۔

۱۹۱۶ء میں انیس احمد بی اے نے اجزائے تفسیر کا جو اس وقت تک مکمل



ہو چکے تھے۔ اردو ترجمہ کر کے مولانا کو دکھایا۔ ایک شہادت کے مطابق اسی سال مولانا نے پارہ عم کا اردو ترجمہ کیا۔ ۱۳ر ستمبر ۱۹۱۶ء کو مولانا نے کمیت رنگ کا ایک گھوڑا خریدا۔

دارالعلوم کالج کے لیے مولانا کا تقرر ابتداءً تین سال کے لیے ہوا تھا۔ یہ مدت ختم ہوئی تو مدت ملازمت میں تین سال کی توسیع ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ کا منشور اول تیار ہوا تو مولانا اس کی تیاری میں شریک تھے یا شریک غالب تھے۔ مولانا کی صدارت میں دارالعلوم میں سائنس کی تعلیم کا فیصلہ کیا گیا۔ مولانا کو دردِ سر کا جو مرض لاحق ہوا اس کی ابتدا حیدرآباد میں ہوئی۔ اس کا ذکر ۵ر نومبر ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں مولانا نے خود کیا ہے۔ دسمبر ۱۹۱۷ء کے ایک سرکاری مراسلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا "کمیٹی ہائے مبصرین" کے رکن تھے۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں مولانا مجلس وضع اصطلاحات کے رکن ہوئے۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو یوپی گورنمنٹ نے ۵۵ برس کی عمر میں مولانا کو ریٹائر کر دیا۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا کا اسکیل نظر ثانی ہوا۔ ابتدائی تنخواہ ۵۰۰ کی بجائے ۶۰۰ کر دی گئی مگر مولانا کو اس کا کوئی فائدہ نہیں پہونچا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی ابتدا عثمانیہ یونیورسٹی کالج سے ہوئی۔ ڈاکٹر رضی الدین کی تصریحات کے مطابق عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے پہلے پرنسپل مولانا فراہی ہوئے۔ (جامعہ عثمانیہ) یہ واقعہ ۱۹۱۹ء کا ہے۔ لیکن تحقیق سے یہ بات درست ثابت نہیں ہوتی۔ ۳ر مئی ۱۹۱۹ء کو مولانا نے نظام دکن سے ملاقات کی۔ یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی جو خود نظام کی خواہش پر ہوئی۔

ملازمت میں توسیع کے بعد ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ مولانا نے ملازمت سے استعفا دے دیا اور وطن واپس چلے آئے۔ ۷ر اگست ۱۹۱۹ء کو مولانا ملازمت سے

سبکدوش ہوئے اور ۲۶ اگست ۱۹۱۹ء کو حیدرآباد سے اعظم گڈھ کے لیے روانہ ہوئے۔ علیحدگی کے وقت مولانا کی تنخواہ ۷۵۰ روپیہ ماہوار تھی نہ کہ ہزار روپیہ۔ ہزار روپیہ اسکیل کی آخری حد تھی۔

قیام حیدرآباد میں مولانا کو علمی کاموں کیطرف توجہ دینے کا بہت کم موقع ملا۔ حیدرآباد کی ملازمت کے چھوڑنے کا ایک بڑا سبب یہی تھا جس کا ذکر مولانا نے خود کیا ہے۔ (الضیاء) تاہم جو کام وہ اس دوران انجام دے سکے ان کا ذکر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے کیا ہے۔

"یہاں کے قیام کے دوران میں آخر زمانہ یعنی مواعظ سلیمانی کی تکمیل کی اور چھپوائی پھر اسباق النحو کے نام سے عربی صرف و نحو کے آسان صورت میں نئے اصول پر اردو میں دو رسالے مرتب کیے اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے وہ چھپے۔ اپنے استاد ادب مولانا فیض الحسن صاحب مرحوم کا عربی دیوان تصحیح کرکے چھپوایا۔ الرای الصحیح تصنیف کی اور تفسیر کے بعض مقدمات لکھے۔" (یاد رفتگاں)

قیام حیدرآباد کے زمانے میں مولانا نے نواب عماد الملک کے انگریزی ترجمۂ قرآن کی اصلاح کا کام انجام دیا جو دستبرد زمانہ کی نذر ہوگیا۔ ایک اردو یونیورسٹی کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ کا خاکہ تیار کرنے میں مولانا فراہی کا حصہ کتنا ہے۔ یہ ایک متنازعہ فیہ اور بحث طلب مسئلہ ہے۔[1] مگر اتنا طے ہے کہ مولانا کا حصہ کم نہیں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے حیدرآباد میں درس قرآن کا سلسلہ

۱؎ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کو مولانا کا خاص کارنامہ بتایا ہے، جس کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے۔



شروع کر دیا تھا۔ لیکن مولانا کے مزاج کے مطابق اس کا حلقہ بہت محدود تھا۔ یہ سلسلہ کچھ خاص لوگوں کی فرمائش پر خواص کے لیے شروع کیا گیا تھا۔

**پھریہا اور مدرستہ الاصلاح میں قیام ۱۹۱۹ء تا ۱۹۳۰ء**

اواخر اگست یا اوائل ستمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا وطن واپس پہونچے۔ اپنے آبائی گاؤں پھریہا میں قیام کیا۔ جو ان کا مسقط الراس اور خاندان کے لوگوں کا مستقل مسکن تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی رشید الدین مرحوم کے علاوہ دونوں بیٹے جوان ہوکر گھر گرہستی اور زمینداری دیکھنے کے لیے کافی تھے۔ اس لیے مولانا کو ادھر سے بے فکری تھی۔ مدرسۃ الاصلاح جس کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں ایک عرصہ سے وابستہ تھے۔ اب موقع ملا کہ وہ بحیثیت ناظم اسے اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنائیں۔ مدرسہ کی انتظامی ہیئت میں ان کا عہدہ ناظم کا تھا جو سب سے بڑا عہدہ ہے لیکن یہ اعزازی تھا۔ یہ عہدہ انکو باقاعدہ انتخاب کے بعد ۲۸ مئی ۱۹۱۶ء کو پیش کیا گیا۔ جس پر وہ بلا انقطاع تسلسل اپنی وفات تک فائز رہے۔ (روداد مدرسہ) اس لیے وہ حیدرآباد سے واپس آئے تو اس وقت بھی ناظم تھے۔ انھوں نے اپنی خدمت کے عوض مدرسہ سے کبھی ایک حبہ بھی نہیں لیا۔ اپنے تمام مصارف وہ اپنی جیب سے پورے کرتے تھے۔ ان کا کھانا تک گھر سے پک کر آتا تھا۔ عام اساتذہ کے برابر ۸ بائی ۱۰ کے ایک کمرے میں وہ رہتے تھے۔ ان کے لیے نہ علیحدہ کوئی دفتر تھا نہ کلاس روم۔ وہ مدرسے میں پڑھاتے نہیں تھے۔ درس قرآن جس میں مدرسے کے اساتذہ شریک ہوتے تھے ایک برآمدے میں ٹاٹ یا چٹائی پر بیٹھ کر ہوتا تھا۔

مدرسہ کی روداد میں مولانا فراہیؒ کا نام ۱۹۱۰ء[1] سے نظر آتا ہے۔

۱؎ حاشیہ ص ۱۰۲ پر ملاحظہ ہو۔

اور حیدرآباد سے واپسی تک کے اس دور میں بھی انھوں نے مدرسے کے لیے بعض اہم خدمات انجام دیں۔ مثلاً مدرسے کا دستور العمل تیار کیا۔ (۱۲ جولائی ۱۹۱۰ء) مولانا کی نظامت میں مدرسے کا تعلیمی سال ماہ شوال سے شروع کرنے کا فیصلہ ہوا (۱۰ جولائی ۱۹۱۲ء) طلبہ کے لیے رجسٹر داخل خارج کا اجراء (ستمبر ۱۹۱۲ء)۔ انگریزی زبان پڑھانے کی ابتداء (اکتوبر ۱۹۱۲ء)۔ رقم سود پر بنک میں جمع کرانے کی بجائے مضاربت پر کاروبار میں لگانے کی تجویز (نومبر ۱۹۱۲ء)۔ مدرسے کی امداد کے لیے دوامی چندے کا اجراء (دسمبر ۱۹۱۲ء) جس کے تحت مولانا نے بھی ایک معقول رقم دے کر پہل کی۔ بطور چندہ مدرسے کے لیے کمرے کی تعمیر کی اسکیم جس کے تحت مولانا نے بھی ایک کمرہ تعمیر کرانے کا ذمہ لیا (اگست ۱۹۱۳ء)۔ سرکاری امداد قبول کرنے کے لیے آزادانہ حکمت عملی کا فیصلہ (اکتوبر ۱۹۱۳ء) مدرسے میں مولانا شبلی ندویؒ متکلم[1] کا تقرر (نومبر ۱۹۱۴ء) مدرسے کی درسگاہ کے لیے بنیاد کی کھدائی میں مولانا کی شرکت (نومبر ۱۹۱۹ء) حیدرآباد سے واپسی کے بعد کا یہ پہلا قابل ذکر اہم واقعہ ہے۔ فیصلہ چندے کے لیے وفد لے کر مولانا فراہیؒ باہر نکلیں۔ (اپریل ۱۹۲۱ء) کمیٹی اصلاح نصاب عربی کی تشکیل جس کے

---

(حاشیہ ص ۱۰۱) مدرسہ کا قیام ۱۹۰۶ء میں عمل میں آیا تھا اسکے بانی مولانا محمد شفیع مرحوم تھے جو مولانا عبدالرحمان پرواز اصلاحی مرحوم سابق رفیق دارالمصنفین اور ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی مرحوم ریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کے والد بزرگوار تھے، مولانا شبلیؒ اور مولانا فراہیؒ کا تعلق مدرسے سے بعد میں ہوا۔ [1] مولانا شبلی ندویؒ متکلم اس مجلس اخوان الصفا کے ایک رکن تھے جو علامہ شبلیؒ کی وفات کے بعد ان کے نامتمام کاموں کی تکمیل کے لیے قائم کی گئی تھی انہیں مدرسۃ الاصلاح کے اہتمام وانصرام کی ذمہ داری تفویض کی گئی۔ مدرسہ کی علمی و تعلیمی شہرت میں مولانا شبلیؒ متکلم کی مساعی جمیلہ کو بڑا دخل رہا ہے، یہ اس سے پہلے ندوہ میں استاد تھے جنوری ۱۹۴۶ء میں وفات پائی۔



ایک رکن مولانا بھی تھے (جون ۱۹۲۱ء)۔ مدرسے سے فراغت کے بعد درجۂ رفاقت کا اجراء۔ جس کے تحت مولوی اختر احسن اصلاحی[1] کو پہلا رفیق مقرر کیا گیا اور ۱۰ روپیے ماہوار وظیفہ دیا گیا۔ اس کے لیے چندہ متعارف ہوا اور پہلا چندہ مولانا فراہیؒ نے اپنی جیب سے دے کر دوسروں کے لیے مثال قائم کی۔ یہ نومبر ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے۔ سنگاپور کے لیے وفد کی روانگی۔ جس میں مولانا امین احسن اصلاحی[2] کو بھی بھیجا گیا (جنوری ۱۹۲۶ء)۔ مدرسے کے نام میں تبدیلی۔ مدرسہ اصلاح المسلمین کی بجائے محض "مدرسۃ الاصلاح" نام رکھا گیا (فروری ۱۹۲۶ء)، مولانا فراہیؒ کی نظامت میں روداد مدرسہ کے مطابق یہ آخری کارروائی ہے۔ اس کے بعد ۱۴ دسمبر ۱۹۳۰ء کے اندراجات ہیں جبکہ ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء کو مولانا اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ ۱۰-۱۱ سال مسلسل مدرسہ پر قیام کر کے مولانا نے اپنے تخیل کے مطابق مدرسہ کو ایک علمی و تعلیمی مرکز بنایا۔ اصل مقالے میں مدرسہ کی تاریخ اور خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں۔ یہ مدرسہ اپنے خصائص کے ساتھ مولانا فراہیؒ کی ایک عظیم یادگار کی حیثیت سے اب تک موجود ہے۔

مولانا کا معمول یہ تھا کہ وہ ہفتے کے تین تین دن شب و روز مدرسہ پر قیام فرماتے اور تین تین دن پھر یہا میں گزارتے۔ جو مدرسہ سے صرف سات میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

---

[1] یہ مولانا فراہیؒ کے خاص شاگرد اور زہد و ورع اور فقر و درویشی میں ان کا مثنیٰ تھے، پوری زندگی بہت قلیل مشاہرہ پر مدرسہ کی خدمت میں گزاری اور مولانا شبلیؒ متکلم کے بعد مدرسہ کے مہتمم ہوئے۔ مولانا امین احسن اصلاحی انکے ہم درس تھے، ۱۹۵۸ء میں وفات پائی۔ [2] مولانا فراہیؒ کے علمی جانشین اور ان کے علوم و افکار کے شارح و ترجمان جن کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے۔

اور سرائے میر کے بعد مشرق میں دوسرا ریلوے اسٹیشن ہے۔ آنے جانے میں کل ایک گھنٹہ صرف ہوتا ہوگا۔ دیار اعظم گڈھ کی ایک معروف شخصیت ڈپٹی عبدالغنی صاحب انصاری[1] اپنی جیب کی طرف سے مدرسے کو پانچ ہزار (۵۰۰۰) کی خطیر رقم اس شرط کے ساتھ دینا چاہتے تھے کہ زرِ موقوفہ کی اصل محفوظ رہے اور سود سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مولانا کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے بلا تامل مدرسہ کے لیے یہ رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے ڈپٹی صاحب مولانا سے ناراض رہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی سے عبدالمجید خواجہ صاحب نے مولانا کو جامعہ میں قیام کرکے درس قرآن کی دعوت دی جو مولانا نے قبول کی اور تقریباً ایک ماہ وہاں قیام کرکے طلبہ و اساتذہ کو مستفید کیا۔ جولائی سنہ ۱۹۲۰ء میں یوپی گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے مولانا کی پنشن کی منظوری کے احکام صادر ہوئے۔ پنشن کی رقم صرف ۳۳ روپیے پانچ آنے تھی۔ مولانا نے سنہ ۱۹۲۴ء میں مدرسہ کے مقاصد کی اشاعت کے لیے مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ برہما کا سفر کیا۔ یہ سفر چونکہ براہ کلکتہ تھا، کلکتہ میں مولانا نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے پاس مسجد ناخدا میں قیام کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں مولانا آزاد نے پھر یہا آکر مولانا سے استفادہ کا پروگرام بنایا مگر وہ نہ آسکے۔ جون سنہ ۱۹۲۷ء میں مولانا نے پورے

[1] ڈپٹی صاحب مرحوم علامہ شبلیؒ اور مولانا فراہیؒ کے عزیز اور مدرسہ کے خاص ہمدردوں میں تھے دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بھی رکن تھے، اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے، کمشنر انکم ٹیکس کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوئے، ریٹائرڈ ہونے کے بعد قومی کاموں میں دلچسپی لیتے تھے، سنہ ۳۶ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یو۔پی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، سنہ ۱۹۶۲ء میں کراچی میں انتقال کیا۔



قافلے کے ساتھ حج کے لیے ارض مقدس کا سفر کیا۔ حجاز میں مقامی علماء کے علاوہ علامہ تقی الدین ہلالی، مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ مولانا سندھی نے اپنی مسند درس مولانا فراہیؒ کے لیے خالی کر دی۔ مولانا فراہیؒ کے درس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم بھی شریک ہوتے تھے۔

**مرض الموت اور وفات سنہ ۱۹۳۰ء**

مولانا کی عام صحت ٹھیک تھی مگر ان کو دو بیماریاں لاحق تھیں۔ ایک دردِ سر کی شکایت دوسری پیشاب رکنے کی بیماری۔ جب دوا علاج سے کام نہ چلتا تو وہ آپریشن کراتے۔ لوگوں کو عام طور پر ان کے ایک آخری آپریشن کا علم ہے۔ لیکن اس سے پہلے بھی وہ کئی آپریشن کرا چکے تھے۔ آخری مرتبہ ان کو پیشاب کی تکلیف ہوئی تو وہ اپنے ایک اہل تعلق اور ذاتی معالج ڈاکٹر حفیظ اللہ[1] کے پاس متھرا گئے جہاں وہ سرکاری ہسپتال میں سول سرجن تھے۔ انھوں نے ایک آپریشن تو گردے کا کیا ساتھ ہی دوسرا آپریشن آنت اترنے کی شکایت تھی اس کا کیا۔ آپریشن یوں تو کامیاب رہا لیکن اسی دوران مولانا کو ہچکیاں آنی شروع ہوگئیں۔ جس کے نتیجے میں ٹانکے کھنچ گئے اور سپٹک ہوگیا۔ جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو تار دے کر عزیزوں کو بلوایا گیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی کو انھوں نے خصوصیت سے طلب کیا۔ انتقال سے پہلے یہ لوگ پہنچ گئے تھے[2]۔ ۱۱ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء کو شب کے ۱۱ بجے انتقال ہوا اور

[1] اپنے وقت کے مشہور سرجن اور مولانا کے ہم وطن اور بڑے عقیدتمند تھے، مولانا کی تصانیف کی اشاعت اور دوسرے علمی، دینی اور تبلیغی کاموں کے لیے پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) کی خطیر رقم عنایت کی تھی جو اعظم گڈھ کے اسٹیٹ بینک میں جمع کی گئی مگر پھر اس کو نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ [2] مولانا کے چھوٹے بھائی مولوی حاجی رشید الدین صاحب مرحوم پہلے سے وہاں موجود تھے (بقیہ حاشیہ ص ۱۰۶ پر)

اگلے دن ۱۲ بجے وہیں متھرا میں غریب مسلمانوں کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ مولانا نے ہجری تاریخ کی رو سے ۶۹ اور عیسوی تاریخ کی رو سے ۶۷ سال کی عمر پائی۔ مولانا کی وفات پر عقیدت مندوں نے مرثیے اور قطعات تاریخ لکھے جو ہم نے کتاب میں جمع کر دیئے ہیں۔

مولانا کی وفات کے وقت ان کی اہلیہ، چھوٹے بھائی حاجی مولوی رشید الدین صاحب اور دونوں بیٹے محمد سجاد اور محمد عباد زندہ تھے۔ اب ان سب کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے بڑے پوتے علی میاںؐ جو مولانا کی گود میں پلے تھے وہ بھی راہی ملک عدم ہوئے۔ حاجی رشید صاحب کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ سجاد صاحب اور عباد صاحب کی اولاد موجود ہے۔ جو مولانا کی نسلی زندگی کی کفیل ہے۔ اور یہ سلسلہ خلفاً عن سلفٍ دراز ہو رہا ہے۔

پسماندگان کے بعد مولانا کی علمی یادگاروں میں کچھ ادارے ہیں جن سے مولانا وابستہ رہے۔ یا جو مولانا کی یاد میں قائم ہوئے، اور ان کی معنوی اولاد انکی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف ہیں۔ یہ خاکہ ناتمام رہے گا اگر ان کے نام نہ درج کیے جائیں۔ لیکن انکے مفصل ذکر کا موقع نہیں۔

---

(حاشیہ ص ۱۰۵ کا) میں نے مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم سے سنا ہے کہ حاجی صاحب مرحوم نے خدمت اور تیمارداری کا حق ادا کر دیا تھا جس سے مولانا بے حد متاثر اور ان کے ممنون تھے اور فرماتے تھے کہ اگر زندہ رہا تو تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو دبوچ کر کئی بار فرمایا "دنیا جی لگانے کی چیز نہیں ہے" لہ یعنی مولوی ابوالحسن علی فراہی اصلاحی سابق ناظم مدرستہ الاصلاح جنوری ۱۹۸۰ء میں وفات پائی۔



مدرستہ الاصلاح سرائے میر، دارالمصنفین اعظم گڈھ، شبلی اسکول اعظم گڈھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ ملیہ دہلی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد وہ ادارے ہیں جن سے مولانا کو کم و بیش نسبت رہی۔ دائرۂ حمیدہ مولانا کی یاد میں ان کے تلامذہ اور عقیدتمندوں نے قائم کیا جس کا دفتر مدرستہ الاصلاح میں ہے۔ انکی مطبوعہ تصانیف درج ذیل ہیں :۔

۱۔ تفسیر سورۂ عبس (عربی)
۲۔ تفسیر سورۂ تحریم (عربی)
۳۔ تفسیر سورۂ کافرون (عربی)
۴۔ تفسیر سورۂ کوثر (عربی)
۵۔ تفسیر سورۂ عصر (عربی)
۶۔ تفسیر سورۂ والتین (عربی)
۷۔ تفسیر سورۂ شمس (عربی)
۸۔ تفسیر سورۂ ذاریات (عربی)
۹۔ تفسیر سورۂ مرسلات (عربی)
۱۰۔ تفسیر سورۂ اخلاص (اردو)
۱۱۔ تفسیر سورۂ قیامہ (عربی)
۱۲۔ تفسیر سورۂ فیل (عربی)
۱۳۔ تفسیر سورۂ لہب (عربی)
۱۴۔ تفسیر سورۂ فاتحہ (عربی)
۱۵۔ تفسیر آیہ بسم اللہ (عربی)
۱۶۔ فاتحہ نظام القرآن (عربی)
۱۷۔ التقائد الی عیون العقائد (عربی)
۱۸۔ الرای الصحیح (عربی)
۱۹۔ جمہرۃ البلاغۃ (عربی)
۲۰۔ مفردات القرآن (عربی)
۲۱۔ دلائل النظام (عربی)
۲۲۔ اسالیب القرآن (عربی)
۲۳۔ اصول التاویل (عربی)
۲۴۔ امعان فی اقسام القرآن (عربی)
۲۵۔ فی ملکوت اللہ (عربی)
۲۶۔ اقسام القرآن (عربی)
۲۷۔ تحفۃ الاعراب (منظوم) (اردو)
۲۸۔ اسباق النحو (اردو)

| | |
|---|---|
| ۲۹۔ اسباق الصرف (اردو) | ۳۵۔ خرد نامہ (دری) |
| ۳۰۔ کتاب الامثال (عربی) | ۳۶۔ ترجمہ پارۂ عم (اردو) |
| ۳۱۔ دیوان حمید (فارسی) | ۳۷۔ ترجمہ رسالہ بدأ الاسلام (فارسی) |
| ۳۲۔ دیوان حمید (عربی) | ۳۸۔ ترجمہ طبقات ابن سعد (فارسی) |
| ۳۳۔ نوائے پہلوی (فارسی) | ۳۹۔ شفاعت اور کفارہ کی تردید میں |
| ۳۴۔ دیوان الفیض (عربی) | ایک رسالہ (انگریزی) |

غیر مطبوعہ تصانیف جو ناتمام حالت میں ہیں:۔

| | |
|---|---|
| ۱۔ حجج القرآن (عربی) | ۱۰۔ الرائع فی اصول الشرائع (عربی) |
| ۲۔ حکمۃ القرآن (عربی) | ۱۱۔ فقہ القرآن (عربی) |
| ۳۔ کتاب الرسوخ فی معرفۃ الناسخ | ۱۲۔ الازمان والادیان (عربی) |
| والمنسوخ (عربی) | ۱۳۔ فلسفۃ البلاغۃ (عربی) |
| ۴۔ احکام الاصول باحکام الرسول (عربی) | ۱۴۔ سلیقۃ العروض (عربی) |
| ۵۔ کتاب العقل وما فوق العقل (عربی) | ۱۵۔ النحو الجدید (عربی) |
| ۶۔ الاکلیل فی شرح الانجیل (عربی) | ۱۶۔ رسالہ فی اصلاح الناس (عربی) |
| ۷۔ اسباب النزول (عربی) | ۱۷۔ الاشراق (عربی) |
| ۸۔ تاریخ القرآن (عربی) | ۱۸۔ مسائل النحو (عربی) |
| ۹۔ اوصاف القرآن (عربی) | ۱۹۔ تفسیر سورۂ بقرہ (عربی) |

۱؎ تمام اجزائے تفسیر فاتحہ نظام القرآن، امعان فی اقسام القرآن اور الرای الصحیح کا سلیس وشگفتہ اردو ترجمہ مولانا کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے کر دیا ہے اور ترجمہ قرآن بھی مکتبہ الحسنات رام پور نے شایع کیا تھا۔



| | |
|---|---|
| ۲۰۔ تفسیر سورۂ آل عمران (عربی) | ۲۵۔ کتاب الدمدمہ والشقمہ (عربی) |
| ۲۱۔ المنطق (عربی) | ۲۶۔ تزکیۃ الروح (عربی) |
| ۲۲۔ مناط صحۃ الحکم (عربی) | ۲۷۔ اصول الفنون (اردو) |
| ۲۳۔ النظر (عربی) | ۲۸۔ منظومۂ صرف (فارسی) |
| ۲۴۔ القسطاس (عربی) | ۲۹۔ مختارات من قسم الشعر (انتخاب عربی) |

مذکورۂ بالا غیر مطبوعہ کتابوں کے نام دائرۂ حمیدیہ میں محفوظ مولانا کے ذخیرۂ مسودات سے لیے گئے ہیں۔

میری کتاب ذکر فراہیؒ میں اساتذہ، تلامذہ، اخلاق وعادات، تصانیف اور مشاہیر کی آراء کے مستقل ابواب ہیں جن کا اختصار اس خاکے میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ اس طرح یہ مضمون بہت طویل ہو جاتا۔

## کتابیات

۱۔ ماہنامہ الضیاء لکھنؤ، مجلد ۲، جزء ۷، ص ۲۶۰ (عربی) ۲۔ یادِ رفتگاں مطبوعہ پاکستان (اردو) ۳۔ مجموعۂ تفاسیر فراہیؒ مطبوعہ پاکستان (اردو) ۴۔ ماہنامہ تذکرۂ دیوبند، ستمبر ۱۹۵۹ء (اردو) ۵۔ قلمی بیاض مولوی محمد مہدی چتاروی۔ ناپید (فارسی) ۶۔ حیات شبلی، دار المصنفین، اعظم گڈھ (اردو) ۷۔ دیوان حمید (فارسی) ۸۔ ریاض الفیض شرح سبعہ معلقہ (قلمی) (عربی، اردو، فارسی) ۹۔ دیوان الفیض (عربی) ۱۰۔ سالانہ رپورٹ سندھ مدرسہ بورڈ، بابت ۱۸۹۶ء۔ ۱۸۹۷ء (انگریزی) ۱۱۔ مکاتیب شبلی حصہ اول وحصہ دوم، مطبوعہ دار المصنفین، اعظم گڈھ (اردو) ۱۲۔ ماہنامہ الندوہ نومبر ۱۹۰۷ء (اردو) ۱۳۔ ماہنامہ الندوہ دسمبر ۱۹۰۵ء (اردو) ۱۴۔ ماہنامہ الندوہ اپریل ۱۹۰۶ء (اردو) ۱۵۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (اردو) ۱۶۔ جامعہ عثمانیہ مولفہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (اردو) ۱۷۔ تذکرہ دار العلوم (اردو) ۱۸۔ روئداد انجمن مدرسہ اصلاح المسلمین سرائے میر (قلمی) (اردو)۔

# اُردو کی ایک قدیم مثنوی

## "احوال قادر ولی" عرف شاہ میران کا تحقیقی جائزہ

از ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، بمبئی

جنوبی ہند کے ایک ساحلی شہر 'ناگور' میں ایک بزرگ مدفون ہیں جن کو وہاں کے لوگ قادرولی کے نام سے یاد کرتے ہیں، ہر سال بڑے پیمانے پر ان کا عرس ہوتا ہے جس میں جنوبی ہند کے کونے کونے سے ہزاروں کی تعداد میں ان کے عقیدت مند شریک ہوتے ہیں اور ان کے مزار پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں، یہ بزرگ کون تھے، کس کے مرید تھے، کس علاقہ سے ان کا تعلق تھا، کس زمانہ میں وہ یہاں آئے تھے، یہ سب وہ سوال ہیں جن کا جواب نہ قادرولی کے عقیدت مندوں کے پاس ہے، نہ تذکرہ نگاروں کے پاس، صرف شیخ محمد اکرام نے اپنی موقر کتاب 'آب کوثر' میں دکن میں اشاعت اسلام کا پس منظر بیان کرتے ہوئے قادرولی کا بھی ذکر کیا ہے لکھا ہے :۔

"جنوبی ہند کے ایک اور بزرگ جو سید نطہر ولی کے بہت بعد پیدا ہوئے لیکن ان کے معتقدین میں شمار ہو سکتے ہیں، (ناگور) ضلع تنجور علاقہ مدراس کے حضرت سید عبد القادر ولی ناگوری تھے، جو شمالی ہند کے شہر مانک پور میں پیدا ہوئے اور حج کے بعد مالدیپ لنکا کے راستے جنوبی ہند میں آئے، ترچناپلی میں حضرت طبل عالم سید نطہر ولی کے مزار کی زیارت کی اور علاقہ تنجور میں ارشاد و ہدایت میں مشغول ہو گئے، ترام میں ایک مسجد تعمیر کی اور پھر ناگور میں، جو ایک بڑی تجارتی منڈی ہے مقیم ہو گئے آپ کے آنے سے اسلام کو بڑی رونق ہوئی اور قریب کے گاؤں دھناسری میں بھی آپ نے حاکم اور رعایا کو مسلمان کیا، اب ناگور جنوبی ہند میں ایک اہم اسلامی بستی ہے جو گزیٹیر کی ترتیب کے وقت نیگاپٹن کی حدود میں شامل تھی اور مسلمان نیگاپٹن کی کل آبادی کا ایک چوتھائی تھے، حضرت قادر ولی کا انتقال سنہ ۱۵۷۰ء میں ہوا۔ تنجور کا راجا آپ کے معتقدین میں سے تھا، چنانچہ اس نے مزار کے مینار تعمیر کرائے، آپ کے مزار پر ہندو مرد اور عورتیں کثرت سے آتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں[1]"۔



اتفاق سے اردو کی قدیم مثنوی کا ایک قلمی نسخہ ہمارے ہاتھ آیا ہے جو قادر ولی کے متعلق ان سارے سوالوں کا اطمینان بخش جواب دیتا ہے۔ چونکہ یہ مثنوی علمی، تاریخی اور دینی اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اس لیے اس کا ایک تحقیقی جائزہ یہاں پیش کیا جاتا ہے :۔

**مثنوی کا نام** عام طور پر قدیم مثنویوں کی تمہید یا خاتمہ میں شاعر اپنا، مثنوی کے نام اور سنہ تصنیف وغیرہ کا ضرور ذکر کرتا ہے مگر چونکہ اس مثنوی کے آخری کچھ صفحات غائب ہیں اس لیے واضح طور پر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس مثنوی کا اصلی نام کیا ہے، البتہ تمہید میں شاعر نے اس تصنیف کی فرمائش کرنے والے کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے :۔

زبانی اس کی مجھ کو بول بھیجا — کہ لکھ احوال تو قادر ولی کا

[1] حاشیے آخر میں دیئے گئے ہیں۔

ہم نے اسی مناسبت سے اس مثنوی کا نام احوال قادر ولی رکھ دیا۔ حالانکہ اس میں انکے حالات زندگی سے زیادہ ان کے حالات سفر اور ان کی کرامات کا ذکر ہے۔

**مصنف کے حالات** مثنوی کے نام کے برعکس اس کے مصنف کے حالات پر مثنوی کی تمہید سے کافی روشنی پڑتی ہے، چنانچہ تمہید میں جو دعائیہ اشعار ہیں ان میں اپنے بیوی بچوں اور دوستوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

ہے بس عاصی اعز الدین نامی     شفاعت سے نبی کی کر گرامی

اس کے علاوہ اکثر مقامات پر مثنوی نگار نے اپنے تخلص کے طور پر نامی کا لفظ دہرایا ہے، اس سلسلہ کے بعض شعر ہیں:

لکھے کیا وصف اس عالی کا نامی     ہے رشک آسماں درگاہ قادر
شہا نامی ہے مقروضی نہایت     کرم سے اپنے کر اس پر عنایت
اسے بھی اے زری زر بخش عالم     دفینہ غیب کا دے کر دے خرم
غرض نامی سے کب ہو اسکی تعریف     مقرب ہے خدا کا شاہ میراں
یہی ہے ملتجی نامی بیدل     کہ ہو آسان جلدی ساری مشکل

وجہ تالیف میں مثنوی نگار نے نام اور تخلص کے علاوہ اپنے بعض ذاتی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے، لکھا ہے:

امیر الملک لعل معدن شان     لقب جس کا ہے ممتاز امیراں
کرم کے بحر کا سنگیں بہادر     عماد الدین محمد خان بہادر
عماد دولت وجاہ خدا داد     مروت کے چمن کا سرو آزاد
تعجب کیا جو کھولا فیض کا باب     کہ دادا اس کا تھا نواب وہاب



شکوہ الملک دادا اس کا تھا جو     سگا بھائی تھا والا جاہ کا او
جو اس کی والدہ خواہر ہے میری     وہ ہمشیرہ حقیقی ہے چچیری
قرابت میں ہے وہ مجھ سے یگانہ     پھر اس پر اب ہوا ہے سمدھیانا
غرض بیٹا مرا داماد اس کا     مخاطب محی دولہ سے جو ہوگا
ہے عرف احمد حسین اسکا زماں میں     رکھے حق خوش اسے دونوں جہاں میں
زبانی اس کی مجھ کو بول بھیجا     کہ لکھ احوال تو قادر ولی کا
خیال اس کا بتایا تھا مجھے خواب     گیا ناگور کو میں ہو کے بیتاب
رسالہ وہاں ملا کنز الکرامت     ہے جس میں سربسر دکھنی عبارت
میں اسکی نقل یک وہاں کر کے پیدا     خوشی سے ساتھ اپنے لے کے آیا
شتاب اس نثر کو تو نظم کر دے     مضامیں کو در معنی سے بھر دے
ولی اللہ کا ہے اس میں مذکور     بنا کر اس کو کر عالم کو مسرور
ہوئی جب اس سے مجھکو یہ اشارت     نظر کر اس کی الفت اور قرابت
سراسر دل شفیعی کر اس بیاں کو     کیا وا نظم ہندی میں زباں کو
اگرچہ میں سدا رہ کر کے بیمار     زمانے کے تھا فکروں میں گرفتار
خیالِ شعر سے یک بار منہ موڑ     دیا تھا مثنوی کہنا ہی میں چھوڑ
سلیماں نامہ جب سے میں بنایا     ارادہ مثنوی کا پھر نہ آیا
جواب قادر ولی نے پھر مدد کی     معاً قدرت بنانے کی مجھے دی
لگا اس مثنوی کے فکر میں میں     لگایا دل ولی کے ذکر میں میں
معانی کے جواہر کے تئیں لا     سر ابیات کو بخشا سراپا

مذکورۂ بالا وضاحت سے مثنوی نگار کے جو حالات سامنے آتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام اعز الدین اور تخلص نامی تھا، نواب آف آرکاٹ محمد علی والا جاہ کے حقیقی بھائی شکوہ الملک کے پوتے امیر الملک عماد الدین محمد خاں عماد الدولہ کی ماں مثنوی نگار کی حقیقی چچیری بہن تھی خود عماد الدولہ کی لڑکی سے مثنوی نگار کے صاحبزادے احمد حسین مخاطب بہ محی الدولہ کا بیاہ ہوا تھا، یعنی مثنوی نگار کا لڑکا محی الدولہ شکوہ الملک کے پوتے عماد الدولہ کا داماد تھا، اس طرح مثنوی نگار کا رشتہ مختلف واسطوں سے محمد علی والا جاہ آف آرکاٹ سے جا ملتا ہے۔

آرکاٹ (مدراس) اٹھارویں صدی کے نصف اول تک ریاست حیدرآباد کا ایک حصہ تھا، نظام الملک آصف جاہ اول نے اپنے عہد حکومت میں انوار الدین کو وہاں کا عارضی نواب مقرر کیا تھا جو سنہ ۱۷۴۳ء میں مستقل طور پر آرکاٹ کے نواب بن بیٹھے، محمد علی والا جاہ انھیں کے چھوٹے صاحبزادے تھے جو چندا صاحب کے ہاتھوں اپنے باپ کے مارے جانے اور بڑے بھائی محفوظ خاں کے اسیر ہو جانے کی وجہ سے سنہ ۱۷۹۵ء میں برسر اقتدار آئے، وہ انگریزوں کے حلیف تھے، انگریزوں نے محمد علی والا جاہ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے عمدۃ الامراء کو آرکاٹ کا نواب مقرر کیا، آرکاٹ کی نوابی کا یہ سلسلہ سنہ ۱۸۵۵ء تک جاری رہا اور نواب غلام غوث خاں آرکاٹ کے آخری نواب تھے۔ جس کے بعد انگریزوں نے ان کے جانشین کو پرنس آف آرکاٹ کا خطاب دے کر ان کی پنشن مقرر کر دی تھی، مثنوی نگار کی وضاحت کے مطابق انھوں نے اسی والا جاہی خاندان کے ایک چشم و چراغ نواب عماد الدولہ کی فرمائش پر یہ مثنوی لکھی ہے اور اس سے پہلے سلیمان نامہ کے نام سے ایک اور مثنوی بھی وہ لکھ چکے ہیں۔



**سنہ تصنیف**

مثنوی نگار نے اپنی مثنوی میں کہیں بھی براہ راست اس مثنوی کے سنہ تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے، البتہ ایک جگہ انھوں نے کسی راجا کے ایک ایسے ہندو نوکر کا ذکر کیا ہے جس نے قادر ولی کی دعاؤں سے صحت یاب ہونے کے بعد ان کو صندل کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک کھڑاؤں کی جوڑی بطور نذرانہ پیش کی تھی جو اب بھی ان کی درگاہ میں محفوظ ہے اور ہر عقیدت مند زیارت کے بعد ان کھڑاؤں کو اپنے سر پر رکھنا بڑی سعادت سمجھتا ہے، مثنوی نگار کا کہنا ہے کہ میں بھی سنہ ۱۲۲۹ھ میں وہاں گیا تھا اور ان کھڑاؤں کو سر پر رکھنے کی سعادت حاصل کی، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

مرض کے دکھ سے آزاد ہو بڑائی — مسلماں ہوگیا شاد ہو بڑا ہی
بنا ایک جوڑی صندل کے کھڑاؤں — دیا لا نذر شہ کے پڑکے پاؤں
بغیر از کھونٹی اور ڈالی سراسر — چلا ہے شاہ دیں اس کو پہن کر
کھڑاؤں وہ ہوئے مقبول شہ کے — پہنتا تھا سدا اس کو خوشی سے
وہی جوڑی ابھی درگہ کے اندر — دھرے ہیں چوکی پر روپے میں مڑ کر
جو جاتا ہے زیارت کو وہاں اب — اسے رکھتا ہے سر پر ہو مودب
تھا بارا سو پہ جب انیسواں سن — یہ عاصی وہاں گیا اور خوش کیا من
کیا درگاہ عالی کی زیارت — کھڑاؤں سر پہ رکھ پایا سعادت

اس وضاحت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مثنوی مثنوی نگار نے سنہ ۱۲۲۹ھ کے آس پاس ہی لکھی تھی،

مثنوی نگار نے اپنی اس مثنوی میں قادر ولی کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ خود مثنوی نگار کی وضاحت کے مطابق دکھنی زبان میں لکھی ہوئی ایک قدیم کتاب کنز الکرامت سے

ماخوذ ہیں، قادر ولی کے ان حالات کی بعض جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

**ولادت** | مثنوی نگار کی وضاحت کے مطابق قادر ولی کی ولادت پنج پیر مانک پور میں ہوئی، ان کی ماں کا نام فاطمہ اور باپ کا نام سید حسن قدوس سامی تھا، دونوں پاک زاد نیک نہاد تھے اور ان کا سلسلہ نسب متعدد واسطوں سے جناب غوث اعظم سے جا ملتا ہے، لکھا ہے:

ہے پورب میں بڑا ایک شہر معمور — کہ ہے نام اس کا مانک پور مشہور
تونگر اور گدا رہتے ہیں اس جا — نہایت ملک وہ آباد ہیگا
کئی پیروں کی ہیں بستی میں درگاہ — زمیں میں سوتے ہیں ہر جا حق آگاہ
ہے گنبد اور مسجد جا بجا واں — بہت ہندو ہیں اور کم ہیں مسلماں
ہے واں پنج پیر کا ایک ٹھان اکیلا — کہ اس جا ہووے ہے ہر سال میلا
وہاں تھی ایک بی بی فاطمہ نام — کہ اس کے معتقد تھے اہل اسلام
تھا اس بانو کا خاوند گرامی — شہ سید حسن قدوس سامی
یہ دونوں پاک زاد و نیک بنیاد — جناب غوث اعظم کے تھے اولاد
غرض وہ بی بی ہر دم کی دعا سے — ہوئی تھی حاملہ فضل خدا سے
ہوا لطف خدا ایک بار ظاہر — شکم میں ماں کے آیا عبد قادر
صدف میں جا انمول گوہر — ہوا نخل تمنا بار آور،
وہ بی بی پاس آ کر خضر یک شب — خوشی سے کہہ سلام حضرت رب
کہا دے گا تجھے خلاق اکبر — پسر یک نیک سیرت اور بہتر
کرے گا حق اسے قطب زمانہ — وہ اپنے وقت میں ہو گا یگانہ



مانک پور یو پی کا ایک چھوٹا مگر مشہور شہر ہے، اس کی مردم خیز زمین نے ہر زمانہ میں بیسیوں صوفیائ، علما اور شعرا کو جنم دیا ہے، تاریخ میں ایسے متعدد بزرگوں کے نام ملتے ہیں جن کا تعلق مانک پور سے تھا، خاص طور پر امیر مینائی کے شاگرد رشید فصاحت جنگ جلیل کو تو کوئی اردو داں بھول نہیں سکتا، ان کا وطن بھی مانک پور ہی تھا۔

**تاریخ ولادت** | قادر ولی کی ولادت مثنوی نگار کی وضاحت کے مطابق سنہ ۹۱۰ھ میں ہوئی ہے، لکھا ہے:

رہا ہے دس مہینے تک برابر — شکم میں ماں کے وہ ماہ منور
سن ہجری ہوئی نو سو پہ دس جب — ہوا پیدا ولی پاک مشرب
ولایت کے فلک کا ماہ نکلا — کرامت کے جہاں کا شاہ نکلا
سعادت کا ہوا ہے خانہ معمور — کیا عشرت سے مانک پور کو پور
نپٹ ہو خرم و خوش والد اس کا — فقیروں کو بہت انعام بانٹا
بفضل حق پسر کا اسم نادر — رکھا شاہ حمید عبد قادر

**پیر و مرشد کی تلاش** | جب قادر ولی سترہ سال کے ہوئے تو ان کے دل میں کسی کو اپنا پیر و مرشد بنانے کی تمنا جاگی، چنانچہ وہ ماں باپ سے رخصت لے کر پیر و مرشد کی تلاش میں نکل پڑے، اس سفر میں ان کی پہلی منزل گوالیار تھی، وہاں انھیں شاہ محمد غوث گوالیاری سے شرف نیاز حاصل ہوا، شاہ غوث نے انھیں اپنا مرید بنایا اور خرقۂ خلافت بخشا اور دس سال اپنی خدمت میں رکھنے کے بعد انھیں سفر حج پر جانے کی اجازت دیدی، چنانچہ بتایا ہے:

ہوی سترہ برس جب عمر قادر — ہوئی اکثر کرامت اس سے صادر

کہا قادر ولی ماں باپ سے تب     کسی صورت مجھے رخصت کرو اب
بنا ہے دل مرا اب سخت شیدا     کروں گا جا کے کوئی پیر پیدا
یہ فضل حق کئی منزل کو طے کر     قدم رکھا ہے آ بستی کے اندر
تھا اس بستی کا نام خوش گوالیار     وہاں طالب کا مطلب تھا نمودار
ہوا فضل خدا تب اس کا دم ساز     دیا ہے غیب سے ہاتف نے آواز
ترا ہے پیر کامل صاحب اسرار     ہے جس کا نام سید غوث شطار
تو جا خدمت میں اسکی با عقیدت     بتاوے گا تجھے راہ حقیقت
ادھر ہو کشف سے مرشد بھی آگاہ     اسی کے آنے کی تھا دیکھتا راہ
یکایک یہ ادھر سے ہو کے بیکل     حضور پیر آیا سر سے تے چل
قدم بوسی کیا اور دست بیعت     کیا حاصل دو جگ کی شان و عزت
غرض خدمت میں مرشد کی جو دس سال     ہوا ہے فیضیاب وہ صاحب حال
خلافت کی ہوئی خلعت عنایت     بنا عالم کا ہادی ہدایت
خوشی سے الغرض قادر ولی کو     کہا مرشد نے اب کعبہ کو جا تو
کیا ہے یاں ادا تو حج اصغر     خدا کے گھر میں جا، کر حج اکبر

شاہ محمد غوث گوالیاری شطاری سلسلے کے ایک اہم بزرگ ہیں اور شیخ فریدالدین عطار کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، شیخ ظہور حاجی حمید نے ان کو اور ان کے بھائی کو پالا پوسا اور سلوک باطن کی تعلیم دی، تیرہ سال کے ریاض کے بعد جب انھوں نے میدان عمل میں قدم رکھا تو ہندوستان میں مغلوں کی حکومت تھی، بابر اور ہمایوں دونوں انکے معتقد تھے مگر جب شیر شاہ برسر اقتدار آیا تو وہ ان سے معاندانہ برتاؤ کرنے لگا



جس کے نتیجے میں وہ اپنے مریدوں کے ساتھ گجرات ہجرت کر گئے اور تقریباً اٹھارہ سال وہاں گزارے، شیر شاہ کے بعد جب دوبارہ مغل برسر اقتدار آئے تو اکبر سے بھی ان کا رشتہ قائم ہو گیا مگر یہ رشتہ کچھ زیادہ مضبوط نہ تھا، حالات سے مایوس ہو کر وہ دوبارہ اپنے وطن گوالیار چلے آئے اور باقی زندگی وہیں گزاری۔

وہ صرف ایک صوفی نہیں بڑے عالم بھی تھے، رسالۂ معراجیہ، جواہر خمسہ، کلید مخازن کنز الوحدت، ضمائر و بصائر اور بحر الحیوٰۃ ان کی مشہور تصانیف ہیں، ۱۵۶۲ء میں ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی اور گوالیار میں مدفون ہوئے، ان کا عالی شان روضہ آج بھی مرجع خاص و عام ہے[۳۱]

**سفر لاہور** | قادر ولی سفر حج کو جانے سے پہلے اپنے مریدوں کے ساتھ لاہور گئے اور کچھ دن وہاں قیام کیا، چنانچہ لکھا ہے:

کئی دن جب چلے منزل بہ منزل     ہوئے لاہور کی بستی میں داخل
مشائخ اور عالم اس جگا کے     ملے حضرت سے استقبال آکے
گئے شان سے بستی کے اندر     اتارے مسجد جامع میں لاکر
ہوا پر نور سارا شہر لاہور     بنا اس ملک کا کچھ اور ہی طور
کرامت کے فلک کا قطب عالی     سعادت کے ولایت کا وہ والی
کئی دن تک رہا اس شہر میں جب     ملے وہاں کے بزرگاں آن کر سب
کئے صحبت سے اسکے کام حاصل     ہوئے اپنے مرادوں سے واصل

**سفر حج کا آغاز** | سفر حج کے لیے خشکی سے زیادہ پانی کا سفر آسان ہوتا تھا، چنانچہ قادرو اور ان کے مریدوں کا یہ قافلہ اب شمال سے جنوب کی طرف چل پڑا، مصنف کی

وضاحت کے مطابق پہلے یہ قافلہ کچی پہنچا اور پھر مالا بار اور کالی کٹ، جہاں سے قافلہ کے یہ سارے لوگ سفر حج کے لیے جہاز پر سوار ہوئے چنانچہ لکھا ہے:

کئی منزل کو طے کر شاہ والا — خدا کے فضل سے کچی کو پہنچا
میاں! بندر ہے واں یک شہر کے پار — ہے پاس اسکے کلی کوٹ اور ملیبار
تمامی قافلہ کو لے کے ہمراہ — مقام اس گاؤں میں آکر کیا شاہ
مریدوں سے کہا دیکھو تو جاکے — کھڑا ہے ناؤ کوئی ریو پہ آکے
جہاز آکر اسی دن یک منور — کھڑا تھا ریو پردے کر کے لنگر
کہے آئے تھے یک بندر سے باہم — عرب کے ملک کو جاتے ہیں اب ہم
کہے جب شاہ سے ہر بات آکر — بجالایا خدا کا شکر سرور
شتابی ناؤ کے نیول کو دیکے — چڑھا اپنے مریداں ساتھ لے کے
ہوا کشتی کا گھر پُر نور و آباد — خلاصی اور معلم ہو گئے شاد

مثنوی نگار نے قادر ولی کے سفر حج کے سلسلے میں جنوبی ہند کی تین جگہوں کے نام لیے ہیں، کچی، کلی کوٹ اور ملیبار۔ (۱) کچی نام کا کوئی شہر اب اس علاقہ میں نہیں ہے شاید موجودہ کوچین (Cochin) ہی کو اس نے کچی کے نام سے یاد کیا ہو۔ اس زمانے میں وہ ایک ہندو ریاست تھی اور اب کیرالا میں شامل ہے۔ (۲) کلی کوٹ کا موجودہ نام کالی کٹ (Calicut) ہے، ایک زمانہ میں وہ ہندوستان کے مغربی ساحل کی ایک اہم بندرگاہ تھی جہاں عربوں کے تجارتی جہاز لنگر انداز ہوتے تھے، بعد میں فرانسیسی اور انگریز تاجروں نے اسی کو اپنی تجارتی منڈی کے طور پر استعمال کیا اور آج بھی ایک ساحلی شہر ہونے کی وجہ سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ (۳) ملیبار (Malabar) کوئی



شہر نہیں ایک علاقہ ہے جو جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر واقع ہے، یہ سارے علاقے ہندوستان کی آزادی سے پہلے پرانے صوبۂ مدراس میں شامل تھے، لیکن آزادی کے بعد جب ہندوستان کی لسانی تقسیم عمل میں آئی تو ان علاقوں کو صوبۂ مدراس سے الگ کر کے ایک مستقل ریاست کا درجہ دے دیا گیا، اس ریاست کو آج ہم کیرالا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

**مناسک حج کی ادائیگی اور واپسی**

یہ جہاز کالی کٹ سے چل کر جدہ میں لنگر انداز ہوا، قادر ولی اپنے مریدوں کے ساتھ وہاں اترے، احرام باندھا اور پا پیادہ ہی حرم کی طرف چل پڑے۔ ایک ایک کر کے سارے مناسک حج ادا کیے پھر مدینہ منورہ جاکر روضۃ النبی صلعم کی زیارت کی اور آخر میں نجف، کربلا اور بغداد کا سفر کر کے وہاں کی برکتوں سے مالا مال ہوئے، اس طرح یہ قافلہ حج و زیارت کے سارے فرائض انجام دینے کے بعد دوبارہ مالا بار لوٹ آیا، اس سفر حج کی بعض تفصیلات خود مثنوی نگار نے اس طرح بیان کی ہیں:

جہاز آکر کیا جدّہ میں لنگر — ولی اترا تب اس بستی کے اندر
کیا واں سے حرم کا جب ارادہ — لگا چلنے خوشی سے پا پیادہ
اتر یک باغ کے اندر وہ طاہر — کیا با پاک باطن غسل ظاہر
وہاں سے آطواف حق ادا کر — دیا بوسہ حجر اسود کو جاکر
مقام خاص ابراہیم میں — مناسک سب ادا کر وہ معلی
مریداں اپنے یک یک لیکے ہمراہ — ادائے حج کیا الحمدللہ
وہاں سے پھر مدینہ کو گیا ہے — سعادت دین و دنیا کی لیا ہے
گیا واں سے نجف اور کربلا میں — سعادت یاب ہو وہ دو جہاں میں

کیا بغداد کی آکر زیارت　　لیا ہے روضۂ جد سے سعادت

کئی دن تک چلا واں سے جو یکبار　　جہاز شاہ آ پہنچا ملیوار

**سفر مدراس** مالابار لوٹنے کے بعد قادر ولی اور ان کے مریدوں نے وہاں قیام نہیں کیا بلکہ اب وہ مدراس کے مغربی ساحل سے نکل کر اس کے مشرقی ساحل کارومنڈل (coromandel) کی طرف چل پڑے، وہاں ان کا جن جن علاقوں سے گذر ہوا، اس کی تفصیل بھی بڑی دلچسپ ہے، یہاں اس کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

**مال دیپ** (Maldives) یہ تقریباً دو ہزار چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل ایک چھوٹا سا ملک ہے، یہاں پہلے ایک مسلم حکومت تھی، لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان پر انگریزوں کے مکمل قبضہ کے بعد یہ سارے جزائر بھی انگریزوں کی حفاظت میں لے لیے گئے، سنہ ۱۹۶۵ء میں انھیں آزادی ملی، اب وہ ایک آزاد مسلم ریاست ہے، یہ ریاست مدراس اور سری لنکا دونوں سے قریب ہے،

مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قادر ولی کے عہد میں شاید یہاں کی زیادہ تر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی، اس لیے انھیں مسلمانوں کے اس قافلہ کا وہاں آنا ناگوار گذرا، چنانچہ انھوں نے ان لوگوں کو کھانے میں زہر دے کر مار ڈالنے کی کوشش کی جو ناکام رہی، اس سازش کا پتہ چل گیا تو وہ لوگ بہت شرمندہ ہوئے اور معافی مانگی اور پھر اپنے دوران قیام میں قادر ولی نے دیوی دیوتاؤں پر لڑکیوں کی بلی چڑھانے کی وہاں کی ایک پرانی رسم کو جس طرح توڑا اس سے وہاں کے عوام بہت متاثر ہوئے اور سب مسلمان ہوگئے۔ لکھا ہے:

چلے کتنے قدم پانی میں سب جب　　کہا مرور نے آنکھیں کھول دو اب



جو دیکھے کھول کے آنکھوں کو اس آن　　ہے شہر مال دیپ آگے نمایاں

فقیروں کو جو دیکھے لوگ وہاں کے　　ہوئے یکدست دشمن ان کی جاں کے

مسلمانوں سے تھا نت انکو انکار　　ہوئے آنے سے ان کے سخت بیزار

ملا کر زہر میوے نذر لائے　　مرید و پیر سب یکبار کھائے

اثر اس زہر کا کچھ نہیں ہوا جب　　نہایت دل میں شرمندہ ہوئے سب

معافی چاہے بھومیں پہ رکھ کے سر کو　　گئے پھر واں سے اپنے اپنے گھر کو

عجب تھا رسم وہاں کا اس زماں میں　　بڑا تھا قاعدہ سب کافراں میں

کہ یک لڑکی کسی کی خوبصورت　　نہ ہوئے جسکے ثانی کوئی مورت

اسے آراستہ کر خوب فی الحال　　کسی دیول میں پہنچاتے تھے ہر سال

شتابی آکے یک جن اس جگا پر　　اسے لے کر کے جاتا تھا اڑا کر

وہاں آیا ہے جب وہ حاکم جن　　قضا را تھا بھگت دینے کا وہ دن

نگاہ جن پڑی جب شاہ دیں پر　　لگا ہے کانپنے دہشت سے تھر تھر

دیا تب حکم جن کو شاہ رہبر　　گیا بارا ہو وہ میتے کے اندر

پکڑ کر قید میں کرنے لگا آہ　　نہیں واں سے نکلنے کی رہی راہ

پھر اس بستی کا حاکم اور ارکان　　دل و جاں سے ہوئے خوش ہو مسلمان

**نتھم** اس نام کا کوئی شہر مدراس کے نقشے میں نہیں ملتا، البتہ مدراس کے ایک ضلع نگر کوئل (Nagercoil) کے انتہائی کنارے کیپ کومرین (cape comorin) کے قریب ایک چھوٹا سا ساحلی شہر ہے جس کا نام ہے مٹم (Muttam) شاید مثنوی نگار نے اسی کو نتھم کے نام سے یاد کیا ہو۔ کیونکہ یہ مالدیپ سے بہت قریب پڑتا ہے۔

مثنوی میں بتایا ہے کہ یہ قافلہ مال دیپ سے نکل کر نتھم پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے پہلے تو بے اعتنائی برتی مگر جب ان لوگوں نے قادر ولی کا ایک کرشمہ دیکھا تو وہ انکی اور ان کے مریدوں کی عزت کرنے لگے، سب مل کر قادر ولی کے پاس آئے اور ہاتھ جوڑے، ان کے سردار نے ان کی خدمت میں ایک تلوار بھی پیش کی، قادر ولی نے اسکو خوشی سے قبول کیا اور پھر لوٹا دیا، خدا نے سردار کے اس حسن عقیدت کے صلہ میں اس کے گاؤں کو اس کی ریاست میں بدل کر رکھ دیا جس پر اس کی موت کے بعد اس کی اولاد نے حکومت کی، لکھا ہے:

وہاں سے چل دیا جب شاہ عالم
ملا شہر یک تھا جس کا نام نتھم

گیا اس گاؤں میں وہ شاہ کامل
رفیقاں ساتھ لے آکر کی منزل

پھر اس بستی کے لوگاں مل کے تھوڑے
حضور شاہ آئے ہاتھ جوڑے

خوشی سے مرد یک تلوار لاکر
کیا ہے نذر شہ کرنش ادا کر

ولی حق نے اس تلوار کو لے
اٹھا کر ہاتھ میں یکدست دیکھے

اسی کو پھر دیئے اپنی طرف سے
کیا ممتاز اس کو اس شرف سے

ہوئی اس روز سے اسکو فراغت
دیا سب گاؤں کی حق نے ریاست

پھر اس کے بعد اسکی ساری اولاد
حکومت سے رہے نت شاد و آباد (باقی)

## حوالے

[1] شیخ محمد اکرام: آب کوثر، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، سنہ ۱۹۶۵ء، ص ۵۹ ۳ [2] محمود بنگلوری: تاریخ جنوبی ہند، پبلشرز یونائیٹڈ بک ڈپو، لاہور، سنہ ۱۹۴۷ء، ص ۲۹۵، ۲۷۹ [3] شیخ محمد اکرام: رود کوثر، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، سنہ ۱۹۶۸ء، ص ۱۴ - ۳۰۔



# اموی دور کی غزلیہ شاعری

از جناب محمد سمیع اختر ریسرچ اسکالر شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

**عمر بن ابی ربیعہ** عمر بن عبداللہ بن ابی ربیعہ بن مغیرہ مخزومی کی پیدائش سنہ ۲۳ھ کو مکہ کے ایک قریشی خاندان میں عین حضرت عمرؓ کے انتقال کے روز ہوئی، اسی لیے اس کے گھر والوں نے اس کا نام عمر رکھ دیا[1]۔ اس کے دادا ابو ربیعہ مشہور نیزہ باز اور والد عبداللہ مالدار تاجر تھے۔ اسکی پرورش عیش و تنعم میں ہوئی تھی۔ اس کی ماں کا تعلق یمن سے تھا۔ وہاں کی لطافت و نزاکت اور امیرانہ زندگی کے اثرات بھی اس پر پڑے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس کے والد عبداللہ کچھ دنوں یمن کے گورنر بھی رہے[2]۔ عیش و عشرت اور لہو و لعب کی زندگی کا اثر اس کی شاعری پر بھی پڑا جس میں زندگی و ہوسناکی کے جذبات و احساسات کی بڑی بے باکی سے تصویر کشی کی گئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زندگی کے آخری دنوں میں وہ ہر طرح کے لہو و لعب اور لغویات سے توبہ کر کے عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گیا تھا[3]۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بڑھاپے میں اس کے قویٰ جب بالکل مضمحل ہو گئے تو مجبوراً وہ اپنی حرکتوں سے باز آگیا[4]۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ضعف و پیری کے زمانہ میں جب وہ شعر کہتا تو ایک غلام کو آزاد کرتا تھا[5]۔

[1] الاعلام ج ۵ ص ۱۹۲ [2] کتاب الاغانی ج ۱ ص ۳۸ [3] عمر بن ابی ربیعۃ المخزومی عمر فروخ ص ۲۱ [4] الشعر والغنائی الامصار الاسلامیہ الدکتور شوقی ضیف ص ۱۳۰ [5] عمر بن ابی ربیعہ۔ جبور ج ۲ ص ۱۹۵۔

اسکی وفات کے بارے میں متعدد روایتیں ہیں جن میں قرین قیاس روایت یہ ہے کہ حج کے لیے آنے والی شریف عورتوں کے بارے میں غزلیہ اشعار کہنے کی وجہ سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اسے جلا وطن کرکے بحر احمر کے ایک جزیرے "دھلک" کی طرف بھیجدیا تھا کچھ عرصہ بعد یہیں ۹۳ھ میں اس کی موت ہوگئی[1]۔

شاعری | عمر اباحیت پسند شعرا کا سرغنہ تھا اس نے شاعری کے اور اصناف کو نظر انداز کرکے صرف تغزل کی جانب توجہ کی۔ اس دور میں شاعری کسب معاش کا ذریعہ ہوگئی تھی۔ لیکن اس نے شاعری کو پیشہ بنانے کے بجائے اسے صرف تشبیب اور تغزل کے دائرے تک محدود کرلیا۔

جدت طبع اس کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ ہر غزل کے اندر اس نے اپنے احساسات وخیالات کو ایک نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر غزلوں میں وہ جاہلی شعرا کی تقلید کرتے ہوئے غزل کی ابتدا محبوب کے ذکر سے کرتا ہے پھر اس سے عشق ومحبت اور وصل وہم آغوشی کی داستان سناتا ہے۔ درمیان میں محبوب کے جسمانی محاسن اور گھوڑے کا وصف بیان کرتا ہے لیکن اس کے والیہ قصیدے میں عشق ومحبت کا نیا طرز دکھائی دیتا ہے، اس سے اس کے خیالات کی جدت وابتکار اور تخیل کی بلند پروازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے یہاں عشق ومحبت کے جذبات خارجی حالات اور اندرونی کیفیات کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ عذری شاعروں کے برعکس اس کی محبت اور سوزش ایک خاص وقت کے لیے ہوتی ہے۔

---

[1] مقدمۃ شرح دیوان عمر بن ابی ربیعۃ المخزومی۔ محمد محی الدین عبد المجید ص۱۹۔



عمر بن ابی ربیعہ کے نزدیک محبت کسی پاکیزہ اور مقدس جذبے کا نام نہیں بلکہ یہ لہو ولعب اور تفریح کا ایک ذریعہ ہے اس لیے اس کے غزلیہ اشعار میں متانت وسنجیدگی اور عفت وپاکدامنی کا کوئی تصور موجود نہیں، وہ عشقیہ خیالات اور شہوانی جذبات کے اظہار میں بسا اوقات مذہبی احکام کی خلاف ورزی کرنے سے بھی باز نہیں آتا[1]۔ ذیل کی مثالوں سے اس کی تصدیق ہوگی۔

ولقد دخلت البیت اخشٰی اھلہ　　بعد الھدو وبعد ما سقط الندیٰ

میں اس کے گھر والوں کے خوف سے اچھی طرح تاریکی اور خاموشی چھاجانے کے بعد اس کے گھر میں داخل ہوا۔

فوجدت فیہ حرۃ قد زینت　　بالحلی تحسبہ بھا جمر الغضا

میں نے وہاں ایک ایسی شریف اور آزاد عورت کو دیکھا جو زیورات کے اندر کسی انگارے کے مانند دمک رہی تھی۔

لما دخلت منحت طرفی غیرھا　　عمداً مخافۃ ان یری ریح الھویٰ

جب میں وہاں پہونچا تو میں نے قصداً اپنی نگاہ کو اس کی طرف سے ہٹالیا کہ مبادا شہوانی جذبات عیاں نہ ہوجائیں۔

فاحببتھا ان المحب معود　　بلقاء من یھوی وان خاف العدیٰ[2]

میں نے اس سے اچھی طرح پیار کیا اور عاشق تو اپنے محبوب سے ضرور ملتا ہے خواہ اسے دشمن کا کتنا ہی خوف ہو۔

ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ زندگی میں عشق ومحبت کرنا ضروری ہے

اذا انت لم تعشق ولم تدرما الھوی　　فکن صخراً من یابس الصخر جلمدا

---

[1] حدیث الاربعاء۔ الدکتور طہ حسین ص۱۹۵ [2] دیوان عمر بن ابی ربیعۃ تحقیق ابراہیم اعرابی ص۱۸
[3] الحب والغزل بین الجاھلیۃ والاسلام۔ عبد اللہ انیس الطباع ص۶۷۔

اگر تم نے عشق نہیں کیا اور سوزشِ عشق کے متعلق تمہیں کچھ معلوم نہیں تو پھر تم میں اور ایک خشک چٹان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

وہ رات کے ختم ہو جانے پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے۔

فبتُّ قریر العین اعطیت حاجتی — اقبل فاھا فی الخلاء فاکثر

میں نے اطمینان اور سکون کے ساتھ رات بسر کی، میری خواہش کی تکمیل ہوئی میں نے تنہائی میں اسکے رخسار کا خوب خوب بوسہ لیا۔

فیالک من لیل تقاصر طوله — وما کان لیلی قبل ذالک یقصر

برا ہو اس رات کا جو اس قدر مختصر ہو گئی جب کہ اس سے قبل میری کوئی رات اتنی مختصر نہیں تھی۔

اس کا تصورِ عشق و محبت یہ تھا:-

انی امرؤ مولع بالحسن اُتبعه — لاحظ لی فیه الا لذة النظر

حسن جہاں کہیں بھی ہو میں اس کا پرستار ہوں، میرا مقصد اس کے سوا مزید کچھ نہیں کہ نگاہوں کو لذت حاصل ہو[1]۔

اس کے تغزل میں انانیت اور خود پسندی بھی ہے، اپنے مشہور لامیہ قصیدے میں وہ ان حسین عورتوں کا ذکر کرتا ہے جو اس سے ملاقات کی خواہشمند ہیں اور آخر کے چند اشعار میں براہ راست اپنی ذات کو تعریف و توصیف کا موضوع بنایا ہے[2]۔ اس کے دیوان میں کثرت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود محبوب کے دیدار یا وصال کے لیے مضطرب نہیں ہے بلکہ خود محبوب پریشان اور بے قرار رہتا ہے اور فرقت و جدائی کے وقت قاصد بھیجتا ہے اور بے قراری میں موت کی تمنا کرنے لگتا ہے۔

۱؎ الحب والغزل بین الجاهلیة والاسلام ص ۲۵-۹۸ ۲؎ دیوان عمر بن ابی ربیعة ص ۳۳



اس نے اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی کسی ایک محبوب کو اپنی تمناؤں کا مرکز نہیں بنایا۔ بلکہ ایک ہی وقت میں متعدد و شریف زادیوں سے اظہارِ عشق و محبت کرتا ہے، ایک ہی قصیدے کے اندر ایک سے زیادہ محبوب کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے محبوبوں کی فہرست بہت لمبی ہے اور وہ ان سب سے اشارے کنائے میں نہیں بلکہ علانیہ تشبیب کرتا ہے۔

اس کے اشعار میں رات کی تاریکی کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ ظاہر ہے لہو و لعب میں دلچسپی لینے والا شخص دن کی روشنی کے بجائے رات کی تاریکی کو ترجیح دے گا۔ اس کا عشق رات کی تاریکی میں ہی زیادہ پروان چڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قصائد کو "لیلیہ" بھی کہتے ہیں[1]۔

سمون یقلن الا لیتنا — نری لیلنا دائماً اشهرا[2]

وہ اپنی سواریوں سے اتریں اور انہوں نے کہا! کاش ایسا ہوتا کہ ہمیشہ مہینوں تک رات ہی رات ہوتی۔

فیغفل ذا الناس عن لهونا — ونسمر فی کلة مقمرا

اور لوگ ہماری لہو و لعب کی حرکتوں سے غافل ہوتے اور ہم پوری پوری رات چاند کی روشنی میں باتیں کرتے ہوئے گزار دیتے۔

اس کی غزل کی ایک نمایاں خصوصیت رجائیت پسندی ہے۔ اس کے نزدیک عشق کا مطلب مایوسی و ناکامی نہیں ہے۔ وہ ہجر و فراق کے عالم میں آنے والی مشکلات و پریشانیوں کو برداشت کرنے اور ان پر صبر کرنے کو حقیقی عشق نہیں سمجھتا۔ وہ ایسی محبت کا سرے سے قائل نہیں جو تفریح کے بجائے دل کا روگ بن جائے، اس کے نزدیک محبت کچھ کھونے کا نہیں بلکہ کچھ پانے کا نام ہے۔ وہ عشق کی راہ میں قربانی دینے اور

۱؎ تطور الغزل بین الجاهلیة والاسلام ص ۳۱۲ ۲؎ عمر بن ابی ربیعة جبور ج ۲ ص ۱۶۹

اپنی ذات کو فنا کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ وہ محبت کی ناکامی پر کبھی اظہار افسوس نہیں کرتا اگر ایک محبوب التفات وعنایت کا دروازہ بند کر دیتا ہے تو وہ دوسرے در پر دستک دیتا ہے۔ اسکے بیشتر قصائد میں سہل پسندی اور سطحیت کا عنصر غالب ہے۔ وہ احساس وشعور کی گہرائیوں تک پہنچنے کے بجائے سطحی جذبات اور پامال خیالات کو پیش کرتا ہے وہ وصل کی حقیقی لذت سے ناآشنا ہے اور ہجر کی کلفت کا بھی اسے کوئی احساس نہیں۔ وہ محبوب کے ظاہری حسن وجمال پر فریفتہ اور مادی لذتوں میں گم رہتا ہے[1]۔

عمر بن ابی ربیعہ کے غزلیہ اشعار میں اس دور کی معاشرتی واجتماعی زندگی کی پوری جھلک آگئی ہے، اس سے اس دور کی عورتوں کے طرز بود وباش کا حال بھی معلوم ہوتا ہے[2]۔

وہ مشکل اور پرشوکت الفاظ کو استعمال کرنے کے بجائے سہل اور کثیر الاستعمال الفاظ کے انتخاب پر زور دیتا ہے۔ اس کے بیشتر اشعار عام فہم اور صنائع وبدائع کی مشکل بندشوں سے آزاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام اور خواص دونوں کے درمیان مقبول ہے۔

اس کے اشعار کسی حکایت یا قصے کے مانند مربوط نظر آتے ہیں۔ اس نے اپنے احساسات وخیالات کی تعبیر کے لیے قصصی اسلوب کو اختیار کیا ہے۔ امرؤ القیس اور دوسرے جاہلی شعراء کے یہاں قصصی اسلوب شکاریات یا جنگوں کی روداد بیان کرنے میں ملتا ہے لیکن عمر بن ابی ربیعہ نے فنی مہارت کے ساتھ عشق ومحبت کی داستان بیان کرنے کے لیے اس اسلوب کو استعمال کیا اور اس کے اندر لطافت اور جدت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی[3]۔

اس کی غزلیہ شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے رسائل کی

[1] تطور الغزل بین الجاہلیۃ والاسلام [2] مقدمہ شرح دیوان عمر بن ابی ربیعہ ص ۲۴

[3] الغزل منذ نشأتہ حتی صدر الدولۃ العباسیۃ۔ ص ۸۲۔



زبان میں غزل کہنا شروع کیا۔ اس طرح کا سب سے طویل خط اس نے ام عثیم کے نام تحریر کیا۔ بسم اللہ سے خط کو شروع کیا۔ سلام ودعا کے بعد اسے اپنی وفا اور محبت کا یقین دلایا۔ اس کے بعد قاصد کی شکایت کی کہ وہ ہمارے مابین پیغام رسانی کا کام اچھی طرح انجام نہیں دے رہا ہے[1]۔ بعض غزلیہ رسائل کے اندر محبوب کی جانب سے ملنے والے خط کے جواب کا ذکر بھی کرتا ہے۔ یہ اس کی شاعری کا بالکل نیا رنگ ہے جو نہ جاہلی دور کی شاعری میں ہے اور نہ اسلامی دور کی شاعری میں۔

عمر بن ابی ربیعہ نے عربی غزل گوئی کو مستقل فن کی شکل دے کر اسے ترقی کی آخری منزلوں تک پہونچا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف اموی دور کی بلکہ عربی غزل گوئی کا امام کہے جانے کا مستحق ہے۔ اس کے بعد کے اکثر غزل گو شعراء نے اس کی خوشہ چینی کی ہے۔

**وضاح یمن** | عبدالرحمن بن اسماعیل وضاح یمن بھی اموی دور کا مشہور غزل گو شاعر ہے۔ جس کی غزل گوئی میں اباحیت پسندی اور مذہبی واخلاقی قیود سے آزادی کا رجحان پایا جاتا ہے، اس کی وفات سنہ ۹۰ھ میں ہوئی[2]۔ بعض لوگ اسے ایرانی الاصل بتلاتے ہیں۔ جہاں سے اس کے آباء واجداد کسی زمانے میں یمن میں آکر آباد ہو گئے تھے[3]۔ دوسرے لوگ اسے عربی نژاد بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بچپن میں اس کے والد کے بعد اس کی ماں نے ایک ایرانی شخص سے شادی کر لی تھی اور یہ اسی کی گود میں پروان چڑھا اور چچا کے مطالبہ کے باوجود اسے دینے سے انکار کر دیا، مقدمہ قاضی کے پاس پہونچا تو ایرانی کے حق میں فیصلہ ہوا۔ عبدالرحمن بڑا خوبصورت تھا۔ قاضی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تم "وضاح یمن" ہو۔

[1] دیوان عمر بن ابی ربیعہ ص ۳۰۹ اور ص ۲۱۳ [2] الاعلام ج ۳ ص ۲۹۹ [3] عمر بن ابی ربیعہ المخزومی و تطور الغزل والنسیب فی الشعر العربی ص ۲۷۔

اسی وقت سے اس کا یہ لقب مشہور ہو گیا[1]۔ عمر بن ابی ربیعہ کی طرح یہ بھی حج کے زمانے میں چھپ کر عورتوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اسی درمیان اسے یمن کی روضہ نام کی ایک حسین لڑکی سے عشق ہو گیا۔ روضہ بھی اس سے محبت کرنے لگی۔ وضاح نے اس سے شادی کا ارادہ کیا لیکن روضہ نے انکار کر دیا کیونکہ اسی دوران اسے جذام (برص) جیسا مہلک مرض لاحق ہو گیا۔ اکثر اشعار میں وہ روضہ سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے اسکے بعد ولید بن عبدالملک کی بیوی ام بنین سے جو بڑی حسین و جمیل تھی عشق ہو گیا۔ ام بنین بھی اس سے محبت کرنے لگی تھی، اسی اظہار عشق کے جرم میں ولید نے اسے دھوکے سے قتل کرا دیا تھا[2]۔

اس نے اپنے اشعار میں دقیق اور فلسفیانہ افکار کو بیان کرنے کے بجائے عشق و محبت کے عام انسانی جذبات و احساسات کو آسان الفاظ، سہل ترکیب اور مناسب تشبیہات کی مدد سے مکالماتی انداز میں موزوں کیا ہے۔ اس کے اشعار میں بھی عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری کی بیشتر خصوصیات موجود ہیں۔ وہ روضہ سے متعلق اپنی الفت و محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

الا لیت الریاح لنا رسول ۔۔۔ الیکم ان شمالا او جنوبا

اے کاش کہ شمال اور جنوب سے چلنے والی ہوائیں ہمارے درمیان پیغام رسانی کا کام انجام دیتیں۔

فتاتیکم بما قلنا سریعا ۔۔۔ ویبلغنا الذی قلتم قریبا

(اگر ایسا ہوتا) تو میری باتیں تم تک اور تمہاری باتیں مجھ تک جلد پہنچ جایا کرتیں۔

الا یا روض قد عذبت قلبی ۔۔۔ فاصبح من تذکرکم کئیبا

اے روضہ سنو! تم نے میرے دل کو عذاب میں مبتلا کر دیا ہے اور میں تمہاری یاد میں حزن و افسردگی

---

۱؎ حدیث الاربعاء ج ۱ ۲؎ الغزل منذ نشأته حتی صدر الدولة العباسیه ج ۱ ص ۷۸



کی زندگی گذار رہا ہوں۔

وتقققنی هواك وکنت جلدا ۔۔۔ وابدی فی مفارقی المشیب[1]

مجھے تیری محبت نے نحیف اور کمزور بنا دیا ہے جب کہ میں قوی اور توانا تھا اور میرے سر میں بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔

اس کے الفاظ کی سہل پسندی، صفائی اور روانی، مفہوم کی سادگی اور مکالماتی اسلوب کا اندازہ دوسرے اشعار سے بھی ہوتا ہے دراصل اس کی شاعری میں اباحی غزل گوئی کی اکثر خصوصیات موجود ہیں۔ نہ اس کے خیالات میں کوئی پیچیدگی ہے اور نہ الفاظ و اوزان کے اندر غرابت،

**عرجی** | محمد بن عبدالرحمن مخزومی عرجی مکہ کے مشہور اباحیت پسند غزل گو شعرا میں تھا۔ وہ خالص عربی النسل تھا اور اس کا تعلق حضرت عثمانؓ کے خاندان سے تھا۔ عمر بن ابی ربیعہ کی طرح اسکے پاس بھی ثروت و دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ طائف کے قریب ہی "عرج" نام سے اس کا ایک علاقہ تھا۔ اس کے باپ دادا اس علاقے کے زمیندار تھے۔ عرجی اسی کی جانب نسبت ہے[2]۔ ابتدا میں عرجی نے شہرت و عزت حاصل کرنے کے لیے بڑی تگ و دو کی، بے دریغ روپیے خرچ کیے اور داد و دہش کی، غزوات میں بھی شریک ہوا اور اپنی شجاعت و بہادری کا سکہ بٹھا دیا مگر جب اپنے مقصد میں ناکام رہا اور اموی حکمرانوں نے اس کی طرف کوئی اعتنا نہیں کیا تو مایوس ہو کر لہو و لعب کی طرف راغب ہو گیا[3]۔ اور عمر بن ابی ربیعہ کی روش اختیار کر کے اباحی غزل گوئی کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ گو دونوں کی زندگی میں فرق ہے عمر تعیشات اور لہو و لعب کے مشاغل پر قانع تھا لیکن عرجی کی غزل گوئی ایک طرح کا ردعمل ہے۔ اس کے

---

۱؎ عمر بن ابی ربیعہ مخزومی ۱۔ عمر فروخ ص ۲۸ ۲؎ کتاب الشعر والشعراء ج ۲ ص ۵۵۶ ۳؎ حدیث الاربعاء ج ۱ ص ۲۴۳۔

اندر کچھ حاصل کرنے کا جذبہ اور لگن ہے۔ ناکامی کی وجہ سے اس کے دل میں اموی بادشاہوں کے خلاف بغض و نفرت کا جذبہ موجزن تھا اور وہ ان کی ہجو کرتا تھا ان کے خاندان کی شریف زادیوں کے ساتھ تغزل کرتا تھا۔[1] ظرافت بھی اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کے تغزل کا اندازہ کرنے کے لیے ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

عوجي علينا ربة الهودج     انك إلّا تفعلي تحرجي[2]

اے پردہ نشین خاتون! میری طرف بڑھو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تم نقصان میں رہوگی۔

اسکی فحش گوئی وغیرہ کی وجہ سے محمد بن ہشام نے اس کی بڑی تذلیل کی اور نو سال تک قید میں رکھا، اسی زمانہ میں اس نے یہ اشعار کہے:

اضاعوني واي فتى اضاعوا     ليوم كريهة وسداد ثغر

ان لوگوں نے مجھے ضایع کر کے ایک ایسے نوجوان کو کھو دیا ہے جو شدید جنگ کا مقابلہ کرنے والا اور سرحدوں کا محافظ تھا۔

وصبر عند معترك المنايا     وقد شرعت اسنتها بنحري

میں نازک موقعوں اور گھمسان کی جنگوں میں بھی ثابت قدم رہنے والا ہوں جبکہ مجھ پر نیزوں کی بارش ہوتی ہے۔

اجرر في الجوامع كل يوم     فيا لله مظلمتي وصبري[3]

مجھے ہر روز محفلوں میں گھسیٹا جاتا ہے، ہائے رے میری مظلومی اور ہائے رے میرا صبر۔

بالآخر قید ہی میں انتقال ہوگیا۔

**حارث بن خالد مخزومی** | حارث بن خالد مخزومی اموی دور میں مکہ کا مشہور غزل گو شاعر اور

---

[1] کتاب الاغانی ج ۱ ص ۱۵۰ [2] فصول فی تطور الغزل والنسیب فی الشعر العربی ص ۲۷ - [3] کتاب الشعر والشعراء ج ۲ ص ۵۵۸ -



عمر بن ابی ربیعہ کا دوست تھا۔ وہ نسباً قریشی تھا۔ شروع ہی سے اس کا میلان لہو و لعب تعیش اور رندی و ہوسناکی کی طرف تھا۔ اس کو سیاست و حکومت کے معاملات سے بھی دلچسپی تھی۔ عبدالملک بن مروان کے عہد میں یہ مکہ کا گورنر بنا۔ مگر بعد میں معزول کر دیا گیا تھا۔

عمر کی طرح اس کی شاعری کا بھی خاص میدان غزل گوئی تھی۔ وہ عمر کا دوست بھی تھا۔ موسیقی، غنا اور عشق و محبت سے دونوں کو یکساں دلچسپی تھی اور وہ اسی کے رنگ میں شعر بھی کہتا تھا۔ خیر الدین زرکلی کے مطابق اس کا دیوان چھپ چکا ہے۔[1] چند شعر ملاحظہ ہوں۔

وترعى من الود الذي كان بيننا     فما يستوي راعي الامانة والمبدي

باہمی الفت و محبت کا کچھ تو خیال کرو، امانت کا پاس کرنے والے اور خیانت کرنے والے دونوں یکساں نہیں ہو سکتے

وقل قد وعدت اليوم وعداً فانجزي     ولا تخلفي لاخير في تخلف الوعد

(ذرا کوئی اس تک میرا پیغام پہنچا دے) اس نے آج جو مجھ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا اس کو پورا کرے اور وعدہ خلافی نہ کرے کیونکہ وعدہ خلافی اچھی چیز نہیں ہے۔

وجودي على اليوم وعدا فانجزي     ولا تبخلي قد مت قبلك في اللحد[2]

آج تم اپنے وصال کے وعدے کو اچھی طرح پورا کردو اور اس میں کوئی بخالت نہ کرو کیونکہ میں تم سے پہلے قبر میں جلنے والا ہوں۔

۸۰ھ میں انتقال ہوا۔ (الاعلام ج ۲ ص ۲۵۴)

**احوص بن محمد انصاری** | عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عاصم انصاری کا شمار بھی اموی دور کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ اس نے بھی عرجی کی طرح شروع میں شہرت کے لیے سیاست کے میدان میں قدم رکھا لیکن اموی حکمرانوں کی بے التفاتی دیکھ کر عمر بن ابی ربیعہ کی طرح

---

[1] الاعلام ج ۲ ص ۱۵۴ [2] عمر بن ابی ربیعہ جبور ج ۲ ص ۸۳ -

لہو ولعب اور تفریحی مشاغل کو زندگی کا مقصد بنا لیا اس کی تشبیب فحش گوئی اور ابتذال کی حد تک پہنچ گئی تھی جس کی وجہ سے اسے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔[1]

اس کی غزلیہ شاعری میں اباحیت پسندی کا رنگ ہے لیکن تشبیب میں فحش گوئی کا رنگ بھی ہے۔ اس نے مدح اور ہجو میں بھی طبع آزمائی کی۔ زبان و بیان کی پختگی اور الفاظ و اوزان کی بندش کے اعتبار سے اس کی شاعری میں کوئی نقص نہیں وہ لفظوں کے انتخاب میں تکلف سے کام نہیں لیتا تھا بلکہ موقع و محل اور موضوع کے اعتبار سے موزوں الفاظ کا انتخاب کرتا تھا۔ اس نے لفظ و معنی دونوں کی خوبی پر زور دیا اور فطری سادگی، روانی اثر آفرینی اور شیرینی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

ادوس ولولا ان اری ام جعفر     بابیاتکم مادرت حیث ادور

جب تک میں ام جعفر کو نہ دیکھ لوں میں برابر اپنے اشعار کے ذریعہ اسکے ساتھ تشبیب کرتا رہوں گا۔

وماکنت زوارا ولکن ذا الہوی     اذا لم یزر لابد ان سیزور[2]

اور میں ملاقات سے زیادہ بھی کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں ہوس کا پجاری ہوں اور جب تک ملاقات نہیں ہو جاتی میں انتظار کر دوں گا۔

**عبید اللہ بن قیس الرقیات[3]** ابن قیس رقیات کا شمار بھی اموی دور کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ سیاست میں وہ زبیری فرقے کا ہمنوا تھا۔[4] اس کی حمایت میں اس نے اموی حکمرانوں سے سیف و قلم دونوں کے ذریعہ جہاد کیا۔ اس نے غزل گوئی کو تفریح کے علاوہ اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف غیظ و غضب اور بغض و نفرت کے اظہار کا ذریعہ

---

[1] کتاب الاغانی ج ۱ ص ۴۵ [2] کتاب الشعر والشعراء ج ۱ ص ۵۰۱ [3] وہ "رقیۃ" نام کی تین عورتوں سے عشق کرتا تھا اسلئے رقیات کے لقب سے مشہور ہوا۔ کتاب الشعر والشعراء ج ۱ ص ۵۲۳ [4] خزانۃ الادب بغدادی ج ۳ ص ۲۶۵۔



بھی بنایا۔ اس کی تشبیب میں اس کے سیاسی حریفوں کی عورتوں کا ذکر ہوتا ہے جس سے اسکی اباحیت پسند طبیعت کو سکون بھی ملتا تھا اور اس کے انتقام و حسد کی آگ کو ٹھنڈک بھی ملتی تھی۔ اس کی تشبیب و غزل کا موضوع مختلف عورتیں تھیں۔ اموی حکمرانوں اور ان کی عورتوں کے خلاف بدگوئی کی بنا پر انھوں نے اس کا خون مباح کر دیا تھا۔ ایک سال تک کوفہ کی ایک عورت کثیرہ نے اسے پناہ دی۔ کہا جاتا ہے کہ ام بنین کی سفارش پر ولید بن عبد الملک نے اسے جان کی امان دی۔[1] اس کی شاعری پر عمر بن ابی ربیعہ کا زیادہ اثر ہے۔ وہ اپنے خیالات کو سیدھے سادے الفاظ لیکن موثر انداز میں بیان کرتا ہے۔

اموی دور میں غزل گوئی کا ایک تیسرا طبقہ بھی تھا یہ روایتی یا تقلیدی غزل گو شعرا کا طبقہ ہے۔ ان لوگوں نے بھی تشبیب کو موضوع بنایا لیکن تغزل کو مرکزی حیثیت نہیں دی، بلکہ جاہلی شعرا کی طرح (مدح، ہجو، فخر، حماسہ وغیرہ) کے تحت قصائد کے آغاز میں تشبیب سے متعلق اشعار کہے۔ اموی دور کے اس طرح کے شعرا میں جریر، اخطل اور فرزدق وغیرہ سر فہرست ہیں۔

---

[1] کتاب الشعر والشعراء ج ۱ ص ۵۲۵۔

## ایک ضروری تصحیح

معارف (دسمبر) ص ۴۱۲ سطر ۱ "انیسویں صدی کے اوائل" کی جگہ "۱۹ویں صدی کے اواخر" پڑھا جائے۔

ص ۴۶۵ اسامہ بن منقذ کی جس جگہ گمشدہ تصنیف کے انکشاف کا میں نے ذکر کیا ہے وہ "التاریخ البدری" نہیں "کتاب اخبار النساء" ہے۔ دونوں کے مصنف اسامہ ہیں اور ابھی حال تک دونوں مفقود تھیں۔ الحمد للہ کہ "اخبار النساء" کا ایک نسخہ غیر مرتب اور ناقص سہی ڈاکٹر احمد خان صاحب (اسلام آباد) کے پاس دستیاب ہوگیا جس کے متعلق عزیز گرامی محمد عزیر شمس (مکہ مکرمہ) کو یقین ہے کہ یہ اسامہ کی تصنیف ہے۔

(پروفیسر) مختار الدین احمد (علی گڑھ)

# قاضی سراج الدین ہندی

از

محمد عارف اعظمی عمری، دار المصنفین

ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں علوم و فنون کی ترقی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے ہندوستانی علماء کی ضو فشانیوں سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری علمی دنیا منور تھی۔ انہی علماء و فضلا میں قاضی سراج الدین ہندی بھی تھے جو ہندوستان میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی۔ پھر وہ مختلف ملکوں کی سیر کرتے ہوئے مصر پہونچے اور یہاں اپنے علم و فن کا سکہ بیٹھا دیا۔

**نام** قاضی سراج الدین کا نام عمر، والد کا نام اسحاق اور دادا کا نام احمد تھا اور ابو حفص ان کی کنیت تھی۔[1]

**ابتدائی حالات** ان کے ابتدائی حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ تاہم ان کی نسبت الغزنوی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے آباء و اجداد کا اصل وطن غزنی تھا، جہاں سے یہ لوگ ہندوستان آئے اور یہیں سنہ ۷۰۴ھ میں قاضی سراج الدین کی ولادت ہوئی۔[2] صاحب تاج التراجم فی طبقات الحنیفہ نے ان کا سن ولادت سنہ ۷۱۴ھ کے قریب بتایا ہے۔[3] جو صحیح نہیں معلوم

---

[1] الدرر الکامنہ / ابن حجر جلد ۳ ص ۱۵۴ [2] نزہۃ الخواطر جلد ۲ ص ۹۵ [3] تاج التراجم فی طبقات الحنیفہ قاسم بن قطلوبغا ص ۱۲۰ مطبوعہ لیپزیک۔



ہوتا کیونکہ خود قاضی سراج الدین ہندی کی یہ تحریر موجود ہے کہ ان کا سن پیدائش سنہ ۷۰۴ھ ہے۔[1]

ابتدا میں قاضی سراج کی تعلیم کیسے اور کہاں ہوئی، اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا تاہم اسکی تصریح ملتی ہے کہ انھوں نے شہر دہلی میں امام وجیہ الدین رازی سے فقہ پڑھی۔[2] اور ان کے علاوہ دہلی اور بدایوں کے متعدد علمائے کبار سے بھی کسب فیض کیا جن میں سراج الدین ثقفی، شمس الدین خطیب الدومی اور رکن الدین بدایونی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔[3]

قاضی سراج الدین کے یہ تمام اساتذہ شیخ ابو القاسم التنوخی کے اہم ترین شاگردوں میں تھے، جن کو حمید الدین ضریر سے اور ان کو کردی کے واسطے سے صاحب ہدایہ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔[4] اس سے قاضی صاحب کی عظمت و کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

**سفر حجاز** ہندوستان میں حصول علم کے بعد قاضی سراج حج بیت اللہ اور حرمین کی زیارت کے ارادہ سے حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں بھی انھوں نے علم و فن کی طلب و جستجو جاری رکھی۔ چنانچہ مکہ مکرمہ میں سدرہ نامی رباط کے ایک شیخ خضر سے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی کتاب عوارف المعارف کا درس لیا، جنھوں نے قطب قسطلانی سے اور انھوں نے براہ راست مولف سے یہ کتاب پڑھی تھی۔[5]

**قاہرہ میں آمد** سنہ ۷۴۰ھ میں قاضی سراج اپنے عہد شباب سے پہلے جب مصر پہونچے[6] تو

---

[1] ابن العماد شذرات الذہب جلد ۶ ص ۲۲۹ [2] ایضاً ص ۲۲۸ [3] تاج التراجم ص ۳۶، مفتاح السعادہ ص ۵۹ نزہۃ الخواطر ص ۹۵ [4] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۴۵-۴۶-۴۹-۹۵-۱۷۶ [5] تاج التراجم ۳۶ و نزہۃ الخواطر جلد ۲ ص ۹۶ [6] الدرر الکامنہ جلد ۳ ص ۱۵۴۔ قاضی صاحب کے مصر پہنچنے کا متعین سال تو معلوم نہیں ہو سکا۔ حافظ ابن حجر نے قبل الاربعین (سنہ ۷۴۰ھ سے پہلے) لکھا ہے مگر قاضی سراج کے مصری استاذوں میں ایک بزرگ احمد بن منصور کا نام ملتا ہے جن سے انھوں نے حدیث پڑھی تھی، حافظ ابن حجر ہی کی تصریح کے مطابق ان بزرگ کا انتقال سنہ ۷۳۶ھ میں ہوا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۷۳۶ھ سے بھی پہلے مصر پہنچ گئے تھے۔

ابتدا میں ان کا قیام وہاں کے حنفی مدرسوں میں رہا۔[1] اس عرصہ میں انھوں نے مصر کے ایک جلیل القدر عالم شیخ احمد بن منصور الجوہری سے حدیث پڑھی۔[2] حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق جب وہ مصر پہونچے تو صاحب علم و فضل ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے وہاں کے دوسرے علماء سے بھی اکتساب فیض کیا جن میں علاء الدین ابن ترکمانی مصنف الجوہر النقی اور شمس اصفہانی جیسے مشاہیر شامل ہیں۔[3] اور خود اہل مصر نے بھی قاضی سراج سے استفادہ کیا۔[4]

**ذہانت اور بحث و مناظرہ سے دلچسپی**

قاضی سراج بڑے ذہین اور قوی الحافظہ تھے، ذہانت اور یادداشت کا یہ حال تھا کہ انھیں اپنے مذہب کے فروع ہر وقت متحضر رہتی تھیں۔[5] جزئیات پر عبور کی وجہ سے وہ بحث و مناظرہ میں فائق رہتے تھے جس سے ان کو خاص دلچسپی تھی وہ نہایت جری، بیباک، حاضر جواب اور فصیح البیان تھے، اپنی طلاقت لسانی حاضر جوابی اور جرأتمندی کی وجہ سے وہ اپنے حریفوں پر چھا جاتے تھے۔

**فقہی مذہب**

قاضی سراج کو حنفی مذہب میں بڑا غلو تھا اور ان کی بدولت اس مذہب کو بڑا فروغ نصیب ہوا، متشدد حنفی ہونے کے باوجود وہ دوسرے مذاہب کے ائمہ کا بھی احترام کرتے تھے، ایک دفعہ ان کو بیماری سے شفا ہوئی تو اسے امام شافعی کی برکت اور فیض کا نتیجہ بتایا۔[6]

**مصر میں انکی شہرت اور عہدہ قضا پر تقرر**

رفتہ رفتہ قاضی سراج کی علمی شہرت مصر میں پھیل گئی۔ چنانچہ وہ فوج کے قاضی مقرر کیے گئے۔[7] اور یہ مصر کی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ کوئی حنفی

---

[1] تاج التراجم ص ۱۲۰ [2] ایضاً ص ۳۶ [3] الدرر ج ۳ ص ۱۵۴ [4] البدر الطالع / شوکانی جلد اول ص ۵۰۵

[5] درر ج ۳ ص ۱۵۴ [6] الدرر الکامنہ جلد ۳ ص ۱۵۵ [7] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۹۶ [8] الدرر الکامنہ ج ۳ ص ۱۵۵ [9] درر ج ۳ ص ۱۵۵۔



عالم اس منصب پر فائز ہوا۔[1] پھر جمال الدین ابن ترکمانی کے جو وہاں کے قاضی القضاۃ تھے نائب مقرر ہوئے۔[2] لیکن قاضی سراج محض کہنے کو نائب تھے دراصل عملاً وہی قاضی القضاۃ تھے۔[3] شعبان ۷۶۹ھ میں جمال الدین ترکمانی کا انتقال ہوا تو وہ باضابطہ قاضی القضاۃ بنا دیئے گئے اور اس منصب پر وہ تاحیات برقرار رہے۔[4] قاضی صاحب نے عہدہ قضا پر مامور ہونے کے بعد حنفی مذہب کو بڑا فائدہ پہونچایا۔

مصر میں عرصہ دراز سے شافعی علما کو غلبہ و اقتدار حاصل تھا اس کے مقابلہ میں احناف کا زیادہ اثر و رسوخ نہ تھا، قاضی سراج نے سب سے پہلے اس کے خلاف سرگرم جدوجہد کی اور سرکاری سطح پر حنفیوں کو شوافع کا ہمسر بنا دیا جس کے لیے انھوں نے حکام سے باقاعدہ گفتگو کر کے یہ فرمان جاری کرایا کہ وہ بھی شافعی قاضیوں کی طرح طرحہ[5] پہنیں گے اور دارالخلافت کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی اپنے نائبین کا تقرر کریں گے اور حنفی خاندان کے یتیموں کی جائداد کے متولی بھی وہی قرار پائیں گے۔[6] جب کہ اس سے پہلے اس قسم کی اجازت وہاں حنفیوں کو حاصل نہ تھی۔

قاضی القضاۃ مقرر ہونے کے بعد قاضی سراج شافعی اوقاف کے بھی نگراں ہو گئے تھے۔ اس وقت انھوں نے جامع ابن طولون کی تولیت کے بارہ میں مصری حکام سے گفت و شنید کی اور انھوں نے وقف طرحی کی تولیت حنفیوں کو واپس دلائی جو اس سے پہلے وہاں کے سربرآوردہ لوگوں کو حاصل تھی۔ کیونکہ اس کے واقف کی یہ شرط تھی کہ اس کے متولی احناف ہی ہوں گے۔[7]

---

[1] تاج التراجم ص ۱۲۰ [2] ایضاً [3] درر ج ۳ ص ۱۵۵ [4] شذرات الذہب جلد ۶ ص ۲۲۸ [5] درر ج ۳ ص ۱۵۵

تاج التراجم ص ۱۲۰ [6] یہ ایک مخصوص قسم کا لباس تھا جو سرکاری قاضی پہنتے تھے [7] درر ج ۳ ص ۱۵۵ [8] ایضاً۔

**جامع طولون میں تفسیر کا درس** جامع طولونی میں شیخ بسطامی تفسیر کا درس دیتے تھے، ۷۷۱ھ میں ان کے انتقال کے بعد یہ خدمت بھی قاضی سراج کے سپرد ہوئی[1] جس کا سلسلہ مدۃ العمر جاری رہا ہوگا، صاحب کشف الظنون نے فن تفسیر میں ان کی ایک تصنیف کا بھی ذکر کیا ہے[2] جس کے متعلق مزید تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔

**وفات** ۷ رجب ۷۷۳ھ کو قاضی سراج کا انتقال قاہرہ میں ہوا اور وہیں دفن کیے گئے۔[3]

بعض لوگوں نے سن وفات ۷۶۳ھ[4] اور تاریخ ۴ رجب بتلائی ہے[5]، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

**ازواج و اولاد** قاضی سراج کے ازواج و اولاد کا کوئی تذکرہ کتابوں میں نہیں ملتا ہے، ابن قطلوبغا کا بیان ہے کہ انھوں نے شادی ہی نہیں کی تھی۔[6]

**تصنیفات** قاضی سراج کو فقہ و افتا اور منطق و کلام پر بڑا عبور تھا۔[7] ان کی بیشتر تصنیفات انہی موضوعات پر ہیں، ذیل میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے :۔

۱۔ التوشیح :۔ یہ ہدایہ کی شرح تھی۔ انھوں نے ہدایہ کی دو شرحیں لکھی تھیں، ایک مطول اور ایک مختصر[8] التوشیح ان کی مطول شرح ہے۔[9] ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مکمل نہیں کر سکے تھے۔[10] ان کی مختصر شرح بھی چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی۔[11] اور اس میں بحث و گفتگو کے لیے استدلال کا پیرایہ اختیار کیا تھا۔[12]

۲۔ الشامل :۔ اس کا موضوع بھی فقہ ہے، جس میں صرف فروعی مسائل کا بیان تھا۔[13]

---

۱ درر جلد ۳ ص ۱۵۵ ۲ کشف الظنون جلد اول ص ۴۸۸ استنبول ۳ تاج التراجم ص ۱۲۰ و درر جلد ۳ ص ۱۵۵ ۴ الطبقات لکھنوی بحوالہ الفوائد البہیۃ ص ۶۰ ۵ البدر الطالع، شوکانی جلد اول ص ۵۰۵ ۶ تاج التراجم ص ۱۲۰ ۷ درر جلد ۳ ص ۱۵۴ ۸ البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۵ ۹ تاج التراجم ص ۱۲۰ ۱۰ کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۳۵ ۱۱ درر ج ۳ ص ۱۵۵ ۱۲ تاج التراجم ص ۳۷ ۱۳ ایضاً و کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۳۵ ۱۴ تاج التراجم ص ۳۶ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۲۵۔



۳۔ شرح المغنی :۔ یہ دو جلدوں میں شیخ عمر بن محمد خبازی کی المغنی فی اصول الفقہ کی شرح تھی۔[1]

۴۔ شرح البدیع :۔ اصول فقہ میں امام احمد بن علی الساعاتی البغدادی کی کتاب نہایۃ الاصول الی علم الاصول ایک مشہور کتاب ہے مصنف نے اس میں اس کی شرح کی ہے[2] جو چار جلدوں میں تمام ہوئی ہے۔[3]

۵۔ شرح الزیادات :۔ یہ امام محمدؒ کی کتاب الزیادات فی فروع الحنفیہ کی شرح تھی۔ صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق یہ شرح نامکمل تھی۔[4]

۶۔ شرح الجامعین :۔ اسی طرح امام محمدؒ کی الجامع الکبیر اور الجامع الصغیر کی شرحیں بھی انھوں نے لکھی تھیں، مگر یہ ناتمام تھیں۔[5]

۷۔ زبدۃ الاحکام فی اختلاف أئمۃ الاعلام :۔ اس کتاب کا ذکر ابن قطلوبغا اور صاحب کشف الظنون دونوں ہی نے کیا ہے۔[6] بظاہر یہ اختلافی مسائل میں اعتدال اور توافق کے موضوع پر کوئی کتاب تھی۔

۸۔ شرح التائیہ ابن الفارض :۔ یہ شیخ عمر بن فارض حموی کے قصیدہ تائیہ کی شرح ہے، قاضی سراج ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے[7] کیونکہ یہ وحدۃ الوجودی صوفی تھے[8]، اور قاضی سراج کو تصوف اور صوفیہ سے بڑی مناسبت تھی، چنانچہ مصر کے ایک حنفی المسلک عالم ابن ابی مجلہ نے جب ابن فارض کے قصیدہ کی تردید لکھی تو قاضی سراج

---

۱ تاج التراجم ص ۳۷ و کشف الظنون جلد دوم ص ۱۷۴۹ ۲ کشف الظنون جلد دوم ص ۱۱۹۱ ۳ تاج التراجم ص ۳۶ ۴ جلد دوم ص ۹۶۷ ۵ تاج التراجم ص ۳۶ ۶ ایضاً و کشف جلد دوم ص ۹۵۰ ۷ کشف جلد اول ص ۲۶۶ ۸ شذرات الذہب جلد ۶ ص ۲۲۸-۲۲۹۔

نے اس پر سخت احتجاج کیا۔[1]

۱۰۔ الغرۃ المنیفۃ فی ترجیح مذہب ابی حنیفۃ: ۔ یہ فقہ حنفی کی تائید میں امام رازی کی ایک فارسی کتاب کا عربی ترجمہ ہے۔ امام رازی نے یہ کتاب سلطان بہاء الدین کے لیے لکھی تھی قاضی سراج نے اس میں مزید دلائل وغیرہ کا اضافہ کرکے اسے امیر صرغتمش کی فرمائش پر عربی میں منتقل کیا، یہ ترجمہ شعبان ۷۵۹ھ کو مکمل ہوا۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی سراج کو عربی کی طرح فارسی پر بھی پوری قدرت اور مکمل عبور تھا۔

قاضی سراج نے تصوف، کلام وعقائد اور خلافیات پر ان کے علاوہ بھی کتابیں لکھیں تھیں مگر اب وہ سب ناپید ہیں۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۴۰، درر ج ۱ ص ۳۳۰ ۔ [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۱۹۸۔

---

دارالمصنفین کی نئی کتاب

## تذکرۃ المحدثین (حصہ سوم)

تذکرۃ المحدثین حصہ سوم چھپ کر تیار ہوگئی ہے یہ دراصل ہندوستانی محدثین کی پہلی جلد ہے جس میں امام صغانی، شیخ علی متقی، شیخ محمد بن طاہر، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، انکے فرزند شیخ نورالحق دہلوی اور ان دونوں کی اولاد و احفاد شیخ الاسلام محمد اور مولانا سلام اللہ محدث رامپوری وغیرہ کے فضل وکمال اور علمی ودینی خدمات کا مرقع پیش کیا گیا ہے اور حدیث میں انکے امتیازات اور کارنامے دکھائے گئے ہیں شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں علم حدیث کی اہمیت وضرورت اور محدثین کی کاوش و دیدہ ریزی واضح کرنے کے بعد ہندوستان میں علم حدیث کی اجمالی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

قیمت:۔ ۵۴ روپیے مرتبہ:۔ ضیاء الدین اصلاحی۔



# اخبار علمیہ

کوپرنیکس اور گلیلیو کے زمانہ سے سائنسدانوں نے حیرت انگیز اور تعجب خیز معلومات فراہم کرنے میں کمی نہیں کی ہے، اب ماہرین فلکیات نے ایک نئے ستارہ کے ظہور کی خبر دی ہے، یہ رقبہ میں روم کے برابر لیکن وزن میں ہمارے سورج سے ڈیڑھ گنا زیادہ ہے۔ سائنسدانوں نے اس ستارہ کو کائنات کا عجوبہ قرار دیا ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ستارہ زمین کے برابر ایک اور روشن ستارہ کے گرد طواف کررہا ہے، انسان کے علم میں اب تک اس قسم کا صرف ایک ستارہ تھا، یہ انکشاف آسٹریلیا کے ایک ریڈیو ٹیلی اسکوپ اسٹیشن پر ہوا اور سائنسی جریدہ نیچر میں اس کی تفصیلات شایع ہوئیں۔

---

سائنسدانوں کی حیرت اور مسرت ابھی کم نہ ہوئی تھی کہ انگلینڈ کی ڈرہم یونیورسٹی کے ماہرین فلکیات نے ایک نئی کہکشاں کے وجود کی خبر دی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ آدھی کائنات پر محیط ہے، پروفیسر رچرڈ ایلیف، ڈاکٹر جری النگورتھ اسمتھ اور مسٹر ایان اسمال وغیرہ اینگلو ڈچ ولیم ہرشل ٹیلی اسکوپ پر مزید طاقتور شیشوں کی مدد سے کہکشاں ABELL963 کا نظارہ کررہے تھے، اسی اثنا میں ان کو چند ہیولے نظر آئے جو دو کمانوں کے مانند تھے، غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ قوسین درحقیقت کسی اور نامعلوم کہکشاں کی روشنی کو ایک عدسہ کی شکل میں جذب کرکے اور کئی گنا زیادہ کرکے عمل انجذاب انعکاس میں مصروف ہیں، بعد میں ABELL 963 نے اپنی

قوت کشش سے اس روشنی کو ہرشل ٹیلی سکوپ کے شیشوں پر منعکس کیا اس کے بعد ۲۰۰۰۰ ملین نوری سال کی اس کہکشاں کا دیدار ہمارے سائنسدانوں کو نصیب ہوا، مخروطی شکل کی خم دار اس کہکشاں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب یہ کائنات اپنی نوعمری میں تھی تب یہ اور اس جیسی دوسری انتہائی فاصلہ والی کہکشائیں وجود میں آئی تھیں۔ اب سائنسداں خوش ہیں کہ تخلیق کائنات کے سربستہ اسرار کا ایک اہم اشارہ انھوں نے پالیا ہے، ہرشل کی ۲ء۴ میٹر دوربین، دنیا کی تیسری سب سے بڑی مشاہداتی دوربین ہے۔

---

ایک طرف سائنسداں آیات سماوات کی دریافت میں مصروف ہیں تو دوسری طرف اور میدانوں میں بھی سائنسداں علم اشیاء کی جہاں گیری میں مشغول ہیں، واشنگٹن پوسٹ کے ایک تازہ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ قمیص کے بٹن کے برابر کمپیوٹر اور ۹۰ میل فی گھنٹہ کے HAMPSTER سائنس اور ٹکنولوجی کے جدید ترین مدارج ہیں، سائنس کی ان ترقیوں کو دیکھتے ہوئے اختصار اور صغر حجم کے لیے اب منی اور مائکرو جیسے الفاظ غیر موزوں ہو گئے ہیں اب نانو NANO پیکو PICO اور فیمٹو FEMTO جیسے انتہائی چھوٹے آلات کا دور ہے جو ایک سکنڈ یا ایک میٹر کے لاکھوں، اربوں اور کھربوں حصے ہیں۔

---

کمپیوٹروں کے متعلق لاس ویگاس کی ایک خبر یہ ہے کہ ۱۹۹۵ء تک چھوٹی جیبی ڈائریوں کے مانند نہایت مختصر اور ہلکے کمپیوٹر تیار ہو جائیں گے جو اپنے مالک کی تحریر، آواز اور صاف و شفاف سہ رخی عکس کو ایک باریک سپاٹ پردہ پر ظاہر کر دیں گے، ان کو جالی دار فون یا ریڈیو کی طرح تمام دنیا سے پیغامات، خبریں بلکہ دستاویزیں وغیرہ بھیجنے اور قبول کرنے کے قابل بھی بنا دیا جائے گا۔

---

قدیم زمانہ میں خاص طور پر بدھوں کے قدیم مخطوطات کی کتابت میں ایک خاص قسم کی روشنائی استعمال کی جاتی تھی جو سونے، چاندی، تانبہ، مرجان، موتی اور دوسرے قیمتی



معدنیات سے تیار کی جاتی تھی، اسے ہفت جواہر کہتے تھے۔ تبت کے قدیم بدھ صحیفوں گنجور، ونجور کی کتابت اسی ہفت جواہر روشنائی سے کی گئی ہے، سنہرے، روغنی ورق پر قدیم منگولیائی حروف، قوس قزح کے تمام رنگوں کی طرح جھلملاتے تھے، اب روس کے سائنسدانوں نے اس قدیم العہد روشنائی کے عناصر کی ترکیب میں از سر نو کامیابی حاصل کر لی ہے۔

---

قدیم و جدید کی یہ دریافتیں حقیقت میں قدرت خداوندی کا مظہر اور درس عبرت و بصیرت ہیں، ویرونا کے شہر LAZISE میں عرصہ ہوئے آثار قدیمہ کی تلاش میں گارڈا جھیل کی تہہ سے ایک روٹی کا ٹکڑا برآمد ہوا تھا اسے ویرونا کے میوزیم آف نیچرل ہسٹری میں رکھ دیا گیا تھا۔ برسوں بعد اس میوزیم کی صفائی میں اس ٹکڑے کا کیمیائی تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ برونز عہد (۱۸۰۰ - ۱۵۰۰ ق-م) یعنی دو ہزار سال قبل مسیح کا ہے، میوزیم کے ڈائرکٹر سارڈینی کے الفاظ میں یہ دریافت اپنی مدت اور کیفیت دونوں اعتبار سے بہت اہم ہے، ۱۰ سینٹی میٹر کی یہ ایک سیاہ رنگ کی نرم روٹی ہے اور ماقبل تاریخ کی طباخی کی جھلک پیش کرتی ہے، خوردبین کے ذریعہ معلوم ہوا کہ یہ گیہوں، جو اور شاید السی کے بیج سے تیار کی گئی تھی۔ گیہوں کا آٹا بھوسی سمیت ...... اپنی صحیح ماہیت میں نظر آیا، ماہرین کے بقول یہ روٹی ہزاروں سال اس لیے محفوظ رہی کہ مرطوب آب و ہوا میں نباتات صحیح سلامت رہتے ہیں جبکہ تیزابی ماحول میں وہ زمین میں جذب ہو جاتے ہیں۔

---

سینۂ گیتی میں محفوظ و مدفون ان شہادتوں کی تصدیق و تکذیب کا اثر کسی نہ کسی حد تک تاریخی حقائق پر ضرور پڑتا ہے، ہندوستان میں اجودھیا میں بھی اسی مقصد کے تحت آرکائیولوجیکل سروے آف انڈیا کے تحت ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک آرکائیولوجی آف دی راماین سائٹس کے نام سے کھدائی کا ایک پروگرام عمل میں آیا، اس کے نگراں (ASI) کے سابق ڈائرکٹر جنرل پروفیسر بی۔ بی لال تھے، انھوں نے اس تفتیش کی مکمل رپورٹ حکومت ہند کے

سپرد کردی، لیکن یہ اب تک شایع نہ ہو سکی، البتہ انڈین آرکائیولوجی ریویو ۷۶-۱۹۷۵ء اور ۸۰-۱۹۷۹ء میں جو مجمل رپورٹ شایع ہوئی اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ رام جنم بھومی کی فرضی جگہ پہ پختہ اینٹوں کے ستونوں کا کہیں وجود نہیں تھا، جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ جہاں اب بابری مسجد ہے وہاں کسی مندر کا وجود تھا اور جسے منہدم کردیا گیا تھا۔ اس کھدائی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اجودھیا کی قدامت زیادہ سے زیادہ ساتویں صدی قبل مسیح کی ہے۔ اس رپورٹ کے متعلق ٹائمز آف انڈیا میں سکینہ یوسف خاں نے مزید معلومات بیان کیے ہیں۔

---

سکینہ یوسف خاں نے اسی اخبار کے ایک شمارہ میں ہندوستان کی مختلف قوموں قبیلوں اور ذاتوں کے متعلق بھی ایک دلچسپ رپورٹ دی ہے، ہندوستان کے ایک ادارہ انتھروپولوجیکل سروے آف انڈیا (A S I) نے "پیپلز آف انڈیا" پروگرام کے تحت ہندوستان کی تمام قوموں اور ذاتوں کا بالاستیعاب جائزہ لیا، یہ پروگرام ۲ اکتوبر ۱۹۸۵ء سے شروع ہوا اور ۵ سال کے بعد سنہ ۹۰ء میں اسے مکمل کیا گیا اسمیں تقریباً ۵۰۰ ماہرین علم الانسان نے حصہ لیا۔ ۲۱,۵۳۶ لوگوں سے بات چیت کی گئی، ان میں ۵,۳۵۳ عورتیں بھی شامل ہیں، قریب ۱۰۰ ورکشاپوں کا اہتمام کیا گیا، ان ماہرین نے ہندوستان کی ۵,۴۱۶ قوموں کا مطالعہ کیا، ان کی بنیاد حکومت ہند کی تیار کردہ فہرست کے مطابق ۴۸۰ شیڈول کاسٹ اور ۵۵۸ شیڈول ٹرائب پر تھی، ان کے علاوہ صوبائی حکومتوں کی فہرستوں کے مطابق ۱۱۳۴ بیک ورڈ طبقے اور منڈل کمیشن کی دوسری بیک ورڈ ذاتوں کی ۱,۲۸۱ طبقے بھی اس میں شامل تھے۔ ماہرین نے ان تمام فہرستوں کو جانچنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اس وقت ہندوستان میں ۴۴۳۴ قومیں آباد ہیں، بعد میں ہم مرتبہ ذاتوں اور قبیلوں کی درجہ بندی اور بعض اقوام سے متعلق ذیلی قبیلوں کے احاطے کے بعد یہ تعداد گھٹ کر ۲۵۸۰ رہ گئی، اب اس جدید و مکمل فہرست



کی رو سے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں ۳۰۰، او بی سی میں ۱۰۲۶، شیڈول کاسٹ میں ۴۳۹ شیڈول ٹرائبس میں ۴۲۶، مسلمانوں میں ۲۸۹، عیسائیوں میں ۲۰، جینیوں میں ۶۰، بدھوں میں ۱۰ اور یہودیوں اور پارسیوں میں بھی دس دس ذاتیں مقرر ہوئیں، ماہرین نے ان تمام قوموں اور ذاتوں کا مطالعہ کیا، چند دور دراز علاقوں کو چھوڑ کر ۴۲۸ ضلعوں اور ۲۶ تہذیبی علاقوں میں ان کا جائزہ لیا گیا اور تقریباً ۵ ہزار صفحات میں ان کی تہذیب، ثقافت، بود و باش رہن سہن، سماجی تقسیم، عمل وراثت، شادی بیاہ، عورت کی حیثیت، مذہبی معاملات، معاشی جدوجہد وغیرہ موضوعات پر داد تحقیق دی گئی بعض نئے معلومات بھی سامنے آئے مثلاً عام خیال یہ تھا کہ ہندوستان کی زیادہ تر آبادی سبزی خور ہے لیکن اس سروے سے معلوم ہوا کہ ۸۰ فیصد آبادی غیر سبزی خور ہے اور گائے اور خنزیر کا گوشت عام طور سے کھایا جاتا ہے۔ شادی بیاہ میں عام تصور تھا کہ یہاں کی شادیاں طے کی جاتی ہیں مگر معلوم ہوا کہ زیادہ تر رواج مرضی کے مطابق رفیق حیات کے انتخاب کا ہے۔ اس عظیم سروے کا مکمل مجموعہ ۱۰۰ جلدوں میں مارچ ۱۹۹۱ء تک چھپ جانے کی توقع ہے، عمدہ بات یہ ہے کہ یہ تمام ذخیرہ کمپیوٹر میں آگیا ہے جس کی وجہ سے کسی بھی ذات و قوم کے متعلق تمام معلومات چند لمحوں میں حاصل ہو سکیں گی۔

---

طبقہ واریت اور انسان کے خودساختہ طبقاتی امتیاز و فرق کے طرفدار اور تاریخی حقائق کو رد کر دینے والے متعصب مزاج و ذہن نے اس وقت ملک کو آتش و خون ریزی کے جس عالم تک پہونچا دیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، ٹائمز آف انڈیا میں یورپ کے ایک مراسلہ نگار ولیم بیچ کا ایک خط ......... شایع ہوا ہے جس میں انھوں نے ہندوستان اور فلسفہ ہندومت سے شیفتگی کے اظہار کے بعد لکھا ہے کہ "اس وقت ہندو مذہب کے مغربی نقادوں اور نکتہ چینوں

کا دفاع دشوار ہو گیا ہے، جن کی سب سے بڑی نکتہ چینی یہ ہے کہ "ہندو مذہب کا فلسفہ جتنا قابل قدر اور وسیع ہے عملاً وہ اتنا ہی محدود ہے، انپشد کی نظر میں سارے انسان برہمن ہیں، ساری کائنات برہمن کے وجود میں ہے اس لیے وہ ساری کی ساری مقدس ہے، اس فلسفہ کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ایسا سماجی نظام ہو جو حریت و مساوات پر مبنی ہو، جس کا ہر جیو، شیو ہو، لیکن مغرب یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ بعید از انصاف ناہمواریاں جیسے ذات پات کا طبقاتی نظام اس معاشرہ میں کیسے رائج ہے، اگر آج سوامی ویویکانند زندہ ہوتے تو وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے سر بکف ہو جاتے، اگر ہندوؤں کا منصف اور شریف الطبع طبقہ اس نازک مرحلہ پر بیدار نہ ہوا تو پھر بدترین ہندوؤں کا تسلط عام ہوگا اور نفرت کی بنیاد پر جو تشدد ہوگا وہ پورے ہندوستان کی بربادی کا باعث ہوگا۔ ہندوؤں کو اب یہ ثابت کرنا چاہیے کہ جس ورثہ اور عمل کی وہ تبلیغ کرتے ہیں، اس کے وہ اہل بھی ہیں یا نہیں"

ولیم بیچ کا یہ سوال ہندوؤں کے علاوہ خود مسلمانوں کے لیے بھی ہے، گذشتہ دنوں مگدھ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور ممتاز اہل قلم جناب ڈاکٹر سید محمد حسنین صاحب پاکستان گئے تو انھوں نے مختلف حیثیتوں سے اس کا مشاہدہ کیا، انکے مشاہدات کا یہ حصہ عبرت کے لائق ہے "سندھ کے اندرونی مشرقی اور پنجاب کے اندرونی مغربی علاقے میں ایسی کور ذہن مسلم آبادیاں اب بھی موجود بتائی گئی ہیں جہاں موروثی دولت کے تحفظ کی خاطر والدین بیٹی کی شادی انجام نہیں دیتے یا ان کا عقد قرآن مجید سے کر دیتے ہیں، یہ معاشرتی زبوں حالی، قدیم ہند کی ان تاعمر کنواریوں کی یاد دلاتی ہے جو دیوداسیاں بن کر زندگی گزارا کرتی تھیں"۔

---

ع۔ ص۔



# وفیات

## مولانا قاضی سجاد حسین

از

پروفیسر مختار الدین احمد علی گڑھ

علمی و دینی حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ اواخر دسمبر ۱۹۹۰ء میں قاضی سجاد حسین دہلی میں رحلت فرما گئے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

قاضی صاحب اپنے وطن کرت پور ضلع بجنور میں ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ متوسطات کی تعلیم حاصل کرکے وہ دار العلوم دیوبند گئے جہاں ۱۹۲۸ء میں ۱۸ سال کی عمر میں انھوں نے علوم اسلامی کی تکمیل کی۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان بھی دیا اور اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ فراغت کے بعد انکا تعلق مدرسہ عالیہ عربیہ فتحپوری دہلی سے ہوا جہاں وہ ۴۵ سال تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے تقریباً تیئس سال تک اسی مدرسے میں شیخ الحدیث کے فرائض انجام دیئے۔ وہ عرصے تک اس مدرسے کے صدر مدرس رہے، انکے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچی۔ ۱۹۶۷ء میں حکومت ہند نے انکے علمی خدمات کے اعتراف میں انھیں پریسیڈنٹ ایوارڈ تفویض کیا۔

تالیف و تصنیف و ترجمے کا شوق انھیں ابتدا ہی سے تھا۔ انکی پہلی تصنیف جو راقم الحروف کی نظر سے گزری وہ "التوشیحات علی السبع المعلقات" تھی۔ سبعہ معلقہ کی اردو میں انکی یہ شرح عرصہ ہوا شائع ہوئی تھی، اب یہ عام طور پر نہیں ملتی۔ قاضی صاحب کی دوسری تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ترجمہ گلستان سعدی۔ سب رنگ کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۲ء

۲- ترجمۂ بوستان سعدی　　سب رنگ کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۱

۳- حاشیہ مالا بدمنہ مصنفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (متوفی ۱۲۲۵ھ) اسکے آخر میں کلمات الکفر منقول از فتاواے برہانی، وصیت نامۂ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، احکام اضحیہ ووجوب آں اور رسالۂ احکام عقیقہ از مولانا عبد الغفار لکھنوی بھی بطور ضمائم شامل ہیں۔ سب رنگ کتاب گھر دہلی، ۱۹۵۶ء

۴- ترجمۂ دیوان حافظ ، سب رنگ کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۳ء

۵- ترجمۂ مثنوی مولانا روم (دفتر اول تا ششم) سب رنگ کتاب گھر، دہلی ۱۹۷۴-۱۹۸۰ء

ان کے علاوہ قاضی صاحب نے دو فارسی وعربی متون مرتب کرکے شایع کیے ہیں:

۶- سراج الہدایہ (ملفوظات مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ۷۰۷-۷۸۵ھ) یہ پروفیسر سید نور الحسن کی توجہ سے انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی سے ۱۹۸۳ء میں شایع ہوئی، کتاب کا تعارف پروفیسر سید نور الحسن کے قلم سے ہے۔

۷- قاضی صاحب مرحوم ومغفور کی زندگی کے آخری پانچ سات سال، آٹھویں صدی ہجری کے ممتاز حنفی عالم وفقیہ شیخ عالم بن العلاء الانصاری الاندرپتی الدہلوی (متوفی ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء) کی ضخیم کتاب الفتاویٰ التاتارخانیہ کی تصحیح واشاعت میں گزرے۔ عہد فیروز شاہ (۷۵۲-۷۹۰ھ) کے اس مصنف نے تقریباً تینتیس ۳۳ فقہی مصادر سے (جن میں متعدد اب مفقود ہیں) یہ ضخیم کتاب مرتب کی تھی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جب اس کتاب کی ترتیب کی خبر فیروز شاہ تغلق (متوفی ۷۹۰ھ) کو ملی تو اس نے مصنف سے خواہش ظاہر کی کہ وہ یہ کتاب اس کے نام پر فتاواے فیروز شاہی رکھیں۔ مصنف نے خدا ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے بادشاہ وقت کی خواہش کا احترام نہ کرتے ہوئے اس کے ایک سردار تاتار خاں کے نام پر اپنی کتاب کا نام رکھا۔ ہر چند نزہۃ الخواطر میں اس کا نام 'زاد السفر' یا 'زاد المسافرین' لکھا ہے (ممکن ہے پہلے مصنف کے ذہن میں یہی نام ہو) لیکن یہ کتاب "الفتاویٰ التاتارخانیہ"



ہی کے نام سے مشہور ہوئی۔

ڈاکٹر زبید احمد مرحوم نے اس کے نسخ قاہرہ، پیشاور، رام پور، حیدر آباد، بانکی پور کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ قاضی صاحب کے پیش نظر چار نسخے رہے جن میں دو تو یہی آصفیہ حیدر آباد اور کتبخانہ خدا بخش کے نسخے ہیں لیکن انھیں دو نئے نسخے بھی حاصل ہو گئے، ایک مفتی عبد الشکور کے کتب خانہ خاص میں اور دوسرا متحف سالار جنگ حیدر آباد میں۔ آخر الذکر دونوں نسخوں کا انکشاف بعد کو ہوا اس لیے ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب ان کے ذکر سے خالی ہے۔ قاہرہ کا نسخہ راقم کی نظر سے گذرا ہے، بہت اچھا نسخہ ہے، میں نے قاضی صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ اس کا بھی عکس منگوالیں لیکن اس کی طرف توجہ کا انھیں موقع نہ مل سکا۔ بہر حال نسخہ سالار جنگ مکمل نسخہ ہے جو ۹ جلدوں میں تمام ہوا ہے اور بہت اچھی حالت میں ہے، اس سے مرتب کو بہت مدد ملی ہوگی

فتاویٰ کی ضخامت کے پیش نظر نویں صدی ہجری میں اس کی تلخیص کا کام ہوا، مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے "ہندوستانی مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت" میں لکھا ہے کہ علمائے حلب میں ایک عالم "ابراہیم بن محمد" نے اس کی تلخیص 'الفوائد المنتخبہ' کے نام سے کیا ہے۔ وہ بظاہر مصنف کی تشخیص نہ کر سکے کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ ابراہیم بن محمد سے تو کوئی کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ یہ اس صدی کے مشہور عالم ومصنف اور محدث سبط ابن العجمی (متوفی ۸۴۱ھ) ہیں جن کا نام برہان الدین ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن خلیل سبط ابن العجمی تھا۔ یہ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں اور ان کی چند کتابیں شایع بھی ہو چکی ہیں۔ متعلقات حدیث پر ان کے تین رسالوں کے نسخے جو مصنف کی نظر سے گزر چکے ہیں اور جن پر ان کی ترمیمات واضافات ہیں راقم اشاعت کے لیے مرتب کر رہا ہے۔

خدا جزائے خیر دے پروفیسر سید نورالحسن کو جو ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ کے ماہروں میں ہیں اور جنھیں فیروز شاہ کے عہد سے خاص دلچسپی ہے، جب انھوں نے وزارتِ تعلیمات کا قلمدان سنبھالا تو "الفتاویٰ التاتارخانیہ" کی اہمیت کے پیش نظر اس کی ترتیب و تصحیح کی طرف قاضی سجاد حسین کو متوجہ کیا اور اس کی تصحیح و ترتیب و اشاعت کے لیے لاکھوں روپیے حکومت ہند سے منظور کرائے۔

پروفیسر سید نورالحسن نے جب وہ علی گڈھ میں صدر شعبۂ تاریخ تھے ایک بار مجھ سے فرمایا کہ فقہی اہمیت تو اس کتاب کی ظاہر ہے لیکن اس کی تاریخی و معاشرتی اہمیت بھی ہے، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عہد فیروز شاہ میں کس قسم کے مسائل سے لوگوں کا سامنا تھا اور کس قسم کے استفسارات، عوام و خواص مفتیانِ دین سے کیا کرتے تھے، فتاوائے تاتارخانیہ سامنے آجائے تو ان مسائل پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

"الفتاویٰ التاتارخانیہ" کی طباعت کا اہتمام مطبع دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد میں ہوا، اس کی جلد اول و دوم سنہ ۱۹۸۴ء میں تیسری جلد سنہ ۱۹۸۶ء میں اور چوتھی سنہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔ ممکن ہے ایک آدھ جلد اور چھپی ہو لیکن وہ میری نظر سے نہیں گزری۔ خدا کرے قاضی صاحب مغفور نے بقیہ مجلدات کی ترتیب و تصحیح کا کام مکمل کر لیا ہو اور کسی دن پوری کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو جائے۔

قاضی سجاد حسین کی وفات دہلی میں ۵ جمادی الآخر سنہ ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۹۰ء کو ہوئی، دوسرے دن اینگلو عربک اسکول میں نماز جنازہ ہوئی اور حوض رانی دہلی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

........ ........



# مطبوعات جدیدہ

**حدائق البیان فی معارف القرآن** مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور صاحب فاروقی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۵۰، قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: جناب مدحت کریم، محمد آباد گوہنہ، اعظم گڈھ، ۲۷۶۴۰۳۔

مولوی عبدالغفور صاحب مرحوم محمد آباد اعظم گڈھ کے رئیس اور اعلیٰ سرکاری عہدیدار ہی نہیں بلکہ ایک صاحب علم و کمال شخص تھے، انکا ذاتی کتب خانہ انکی علمی دلچسپی کا ثبوت تھا، جسکی اکثر کتابیں بعد میں دارالمصنفین میں منتقل ہو گئی تھیں، انکو تصنیف و تالیف کا ذوق بھی تھا، اس صدی کے اوائل میں مصباح الکلام فی طریق الاسلام اور حدائق البیان فی معارف القرآن کے نام سے انھوں نے دو اہم اور مفید کتابیں لکھی تھیں، لیکن اب یہ نایاب تھیں اس لیے انکے ایک لائق خلف جناب مدحت کریم نے موخر الذکر کا دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے اس کے ۳۰ حدائق میں قرآن مجید کے حسب ذیل علوم و معارف بیان کیے گئے ہیں، وحی و قرآن، سورہ و آیت کا مفہوم، نزول قرآن کی کیفیت، سورتوں، آیتوں، کلمات، حروف و حرکات کی تعداد، مکی و مدنی سورتیں، قرآن کی پاروں اور منزلوں میں تقسیم، اوقاف، جمع و ترتیبِ قرآن، قرآنی رسم الخط، اعجاز قرآن، مشہور قراتوں اور قاریوں کا تذکرہ، قرآن کے تحریف سے پاک ہونے، بسم اللہ کے جز اور آیت قرآن ہونے، نماز میں سورہ فاتحہ کے پڑھے جانے، امام ابو حنیفہؒ کے حالات و کمالات، تعوذ، قرآن و سنت، قرآن پڑھنے کے فضائل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن سورتوں کو نماز میں پڑھتے تھے، قرآن پڑھنے اور اسکی تعلیم دینے پر اجرت، اسکو یاد کرنے کی فضیلت اور یاد کر کے بھول جانے پر وعید، تلاوت قرآن کے آداب وغیرہ اور ان کے ضمن میں دوسرے ضروری اور متعلقہ

امور پر اپنے زمانہ کے انداز و رجحان کے مطابق سیر حاصل بحث کی ہے جن کو اب بھی پڑھنا فائدہ سے خالی نہیں، اس لحاظ سے اس کتاب کی دوبارہ اشاعت ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے۔

**انڈیا ونس فریڈم ایک مطالعہ**

از پروفیسر ریاض الرحمان خاں شیروانی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۷۳، قیمت ۴۰ روپئے
پتہ: اکیڈمک بکس، ڈگی روڈ، علی گڑھ۔

انڈیا ونس فریڈم مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی بڑی متنازعہ فیہ تصنیف ہے، اس میں زہر ہلاہل کو قند نہ کہنے کی بنا پر مولانا سے اپنے اور بیگانے دونوں ناخوش ہیں، ایک گروہ تو اسے مولانا کی تصنیف ہی نہیں سمجھتا، پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی کے تعلقات مولانا سے پشتینی ہیں اور وہ خود بھی انکے عقیدتمند اور بڑے مزاج شناس ہیں، انھوں نے مولانا پر اتنا لکھا ہے کہ وہ ان پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کتاب میں انڈیا ونس فریڈم کے مشمولات کا جائزہ بڑی دقت نظر سے لے کر اس پر کی جانے والی تنقیدوں کا جواب دیا گیا ہے اور شروع ہی میں وثوق و اعتماد سے اسے مولانا کی تصنیف قرار دیا گیا ہے، مصنف نے بتایا ہے کہ پروفیسر ہمایوں کبیر نے مولانا کے خیالات میں کوئی رد و بدل نہیں کیا ہے بلکہ ان کی اردو کو انگریزی کا جامہ پہنا دیا ہے اور یہ کام بھی اپنے امکان بھر خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے، مولانا کی کتاب تین ۳ حصوں پر مشتمل تھی، زیر نظر کتاب بھی تین ۳ حصوں پر مشتمل ہے، لیکن اس میں مولانا کی زندگی کے ان واقعات و حالات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جو سنہ ۱۹۳۵ء سے سنہ ۱۹۴۸ء تک کے درمیان پیش آئے، دراصل مولانا کی کتاب کا زیادہ اہم اور جاندار حصہ یہی ہے، کیونکہ سنہ ۳۵ء کی دستوری اصلاحات کے بعد کا



زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑا اہم ہے، اس زمانے میں ملک میں دو عام انتخابات ہوئے، اکثر ریاستوں اور مرکز میں کانگریس کی حکومت بنی، ملک کو آزادی ملی، اور وہ منقسم بھی ہوا، ہولناک فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور گاندھی جی گولی کا نشانہ بنے، غرض اس دور میں متعدد دور رس نتائج کے حامل واقعات اور اہم سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کے مولانا عینی شاہد ہی نہیں تھے بلکہ ان سب میں ان کا موثر اور فیصلہ کن حصہ رہا ہے، انڈیا ونس فریڈم میں ان پر جو بحث و تنقیح اور تبصرہ و تجزیہ کیا گیا ہے مصنف نے بڑی دیدہ ریزی سے انکا جائزہ لیکر دکھایا ہے کہ عموماً مولانا کے اخذ کردہ نتائج انصاف و حقیقت پر مبنی ہیں اور ان سے انکی ہوشمندی، دور اندیشی، سیاسی بصیرت، خود اعتمادی، جرأت کردار اور قومی و وطنی سیاست میں انکے بلند درجہ کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا کے حریفوں اور حلیفوں نے ان پر جو چھینٹے ڈالے ہیں وہ انکی غلط بینی اور کج اندیشی کا نتیجہ ہیں، مصنف کی کتاب کا یہ حصہ اس زمانہ میں لکھا گیا تھا جب مولانا کی کتاب کا پہلا نامکمل اڈیشن سنہ ۱۹۵۹ء میں چھپا تھا، دوسرے حصہ میں انڈیا ونس فریڈم کے ان مندرجات کا جائزہ لیا گیا ہے جو ۳۰ برس بعد سنہ ۸۸ء میں شائع ہوئے تھے، لائق مصنف اسی جدید مواد کو دوسرے حصہ میں زیر بحث لائے ہیں ان میں مندرجہ ذیل حضرات مولانا کی تنقید کا نشانہ بنے ہیں، ڈاکٹر سید محمود، شری کرشنن مینن، سردار ولبھ بھائی پٹیل ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال نہرو، معترضین نے اور لوگوں سے قطع نظر کر کے صرف پنڈت جی سے اختلاف کو زیادہ ہوا دی ہے، اس لیے لائق مصنف نے جہاں ان سے مولانا کے اختلاف کو درست بتایا ہے وہاں دونوں کے خوشگوار تعلقات بھی دکھائے ہیں، اس اشاعت کے بعد راج موہن گاندھی نے مولانا کے جواب میں جو کتاب لکھی ہے اسے بے وزن اور ناقابل اعتبار بتایا گیا ہے، انڈیا ونس فریڈم کی پہلی اشاعت کے بعد اس کا پہلا اردو ترجمہ

مرحوم رئیس احمد جعفری نے کیا تھا، اس میں ہر باب کے آخر میں مولانا پر جو تعریضیں کی گئی ہے تیسرا حصہ اسی کا جواب ہے، یہ کتاب نصف صدی پیشتر کے واقعات کی ایک مستند تاریخی دستاویز ہے، جس سے اس دور کے قومی و سیاسی حالات کا مرقع سامنے آجاتا ہے، اس کی اشاعت پر مصنف و ناشر دونوں آفریں کے مستحق ہیں۔

**صہبائے ہند** از جناب نشور واحدی مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۶۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۸۰ روپیے، پتے: (۱) دانش محل، امین آباد لکھنؤ (۲) ماڈرن بکڈپو، بیکن گنج، کانپور۔

جناب نشور واحدی مرحوم فارسی و عربی کے منتہی اور اردو کے مشہور و ممتاز شاعر تھے ان کی توجہ نثر نگاری کی طرف بھی رہی لیکن شاعر کی حیثیت سے ان کو زیادہ شہرت ملی۔ مشاعرے ان کی شرکت کے بغیر نامکمل سمجھے جاتے تھے اور وہ اپنے حکیمانہ خیالات سے زیادہ اپنے اچھے ترنم کی وجہ سے مشاعروں میں بہت پسند کیے جاتے تھے، نظم و نثر میں مرحوم کی کئی تصانیف شایع ہوچکی ہیں، ان کا پہلا مجموعہ کلام صہبائے ہند کے نام سے نصف صدی قبل طبع ہوا تھا جو دراصل مثنوی ہے، اس میں آفاقیات و ماورائیات کے عنوانات سے اہم فلسفیانہ خیالات پیش کیے گئے ہیں، ماورائیات میں مثنوی مولانا روم کے دفتر اول کے بعض حصوں کا منظوم ترجمہ کیا ہے جو کیفیت اور دلکشی سے خالی نہیں ہے، مجموعہ کے آخر میں غزلیں، رباعیات، قطعات اور متفرق اشعار دیے گئے تھے، اب نشور مرحوم کے صاحبزادے جناب نیاز واحدی نے اس مجموعہ کو دوبارہ نہایت خوشنما حالت میں شایع کیا ہے، اس کے شروع میں وہ تمام تحریریں بھی اکٹھا کر دی گئی ہیں جو وقتاً فوقتاً نشور صاحب کے کلام کے بارے میں لکھی گئی تھیں، بنیادی طور پر نشور صاحب فلسفیانہ خیالات رکھنے والے



ایک شاعر تھے۔ ابتدا میں یہ رنگ اتنا نمایاں تھا کہ اس کی وجہ سے ان کی شاعری مشکل اور دقیق خیال کی جاتی تھی مگر پختگی کے بعد انھوں نے خود اس کو کم کرنے کی کوشش کی، غزلوں میں پاکبازانہ تخیل کے ساتھ رندانہ انداز اور بڑی سرمستی و سرشاری نظر آتی ہے اور نظموں اور غزلوں دونوں میں نشور صاحب کا مخصوص رنگ نمایاں ہے زبان و بیان کی نفاست و لطافت اور ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں کی شگفتگی و دلآویزی نے ان کی شاعری کو کیف و اثر سے معمور کر دیا ہے۔ ابھی تک نشور صاحب کی طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ نیاز صاحب نے یہ مجموعہ شایع کرکے نشور صاحب کے جلائے ہوئے چراغِ محبت کو ہواؤں کی زد سے بچانے کی کوشش کی ہے، خدا کرے وہ اس میں کامیاب ہوں۔

**ختم المرسلینؐ[1] و لہجے کے چراغ[2]** از جناب عروج زیدی مرحوم، مرتبہ جناب عرفان زیدی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات [1] ۸۴ و [2] ۱۹۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت بالترتیب ۷ و ۹ روپے پتے: (۱) جناب عرفان زیدی، حضرت عروج زیدی روڈ، رام پور (۲) مکتبہ ذکری گھیر سیف الدین خاں رام پور۔

جناب عروج زیدی مرحوم کو نظم و نثر دونوں کا اچھا ذوق تھا اور انھوں نے دونوں میدانوں میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں لیکن ان کا رجحان طبع شاعری کی طرف زیادہ تھا اور وہ ایک پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے، شاعری کی مختلف صنفوں میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے، ان کی شاعری فکر و ریاض کا نتیجہ اور رکاکت و ابتذال سے خالی ہوتی تھی۔ ان کی بامقصد شاعری سے صحیح اور صالح رجحانات کو قوت و تازگی ملتی تھی، ترقی پسندی اور جدیدیت کے شور و غوغا میں بھی وہ ان کی بے راہ روی سے محفوظ رہے، کلاسیکل شاعری کی

صحت مند روایتوں کو عزیز رکھنے کے باوجود انھوں نے ادب کے نئے رجحانات کا خیر مقدم کیا ہے، وہ موجودہ حالات اور لوگوں کے دکھ درد اور ماحول کی خرابیوں پر بھی نظر رکھتے تھے اور ان کا مداوا اور حل پیش کرتے تھے، پُر آشوب حالات میں بھی وہ ہمت و حوصلہ کو قائم رکھکر ہوا کے جھونکوں میں اپنے چراغِ دل کو روشن کر کے دوسروں کو روشنی دیتے رہے ہیں، ان کا پیرایہ اظہار اثر انگیز اور اندازِ بیان رچا ہوا ہے، اس لیے بوجھل موضوعات اور خشک خیالات کے باوجود ان کی شاعری پُر کیف اور تغزل کی لطافت و دلآویزی سے معمور ہوتی ہے، عروج صاحب کی زندگی میں ان کے کلام کے متعدد مجموعے چھپے ہیں جن سے ان خصوصیات کا پتہ چلتا ہے، اب ان کے لایق اخلاف خصوصاً بڑے صاحبزادے جناب عرفان زیدی نے اُن کی اِن غیر مطبوعہ تصانیفِ نظم و نثر کو شایع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جن کو وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں، یہ دونوں مجموعے اسی سلسلہ کی کڑی ہیں اول الذکر نعتوں پر مشتمل ہے، نعت بڑی مشکل اور نازک صنفِ سخن ہے اس میں ذرا بھی افراط و تفریط ناروا ہے لیکن عروج صاحب کی مشاقی نے یہ مرحلہ بھی طے کرنے کی کوشش کی ہے گو کہیں کہیں اس راہ میں نازک مقام آگئے ہیں۔ لایق مصنف فضائل کی ضعیف اور رطب و یابس روایات سے صرف نظر نہیں کر سکے ہیں تاہم اس سے ان کی طبیعت کی سرشاری اور مستی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و محبت اور والہانہ تعلق کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، دوسرا مجموعہ غزلوں اور قطعات پر مشتمل ہے جو زیدی صاحب مرحوم کے حسن بیان اور رعنائی خیال کا نمونہ اور اچھے ادبی ذوق اور سنجیدہ و با مقصد شاعری کا ثبوت ہے، امید ہے کہ ان کے پہلے مجموعوں کی طرح انھیں بھی شہرت و قبولیت نصیب ہوگی۔

"ض"

# تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔ قیمت ۵۸/=

۲۔ سیرۃ النبیؐ جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ ۵۸/=

۳۔ سیرۃ النبیؐ جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔ ۲۸/=

۴۔ سیرۃ النبیؐ جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ ۵۸/=

۵۔ سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ ۲۳/=

۶۔ رحمت عالمؐ۔ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔ ۷/=

۷۔ خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ ۱۶/=

۸۔ سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔ ۲۵/=

۹۔ حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ ۵۸/=

۱۰۔ ارض القرآن ج ۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔ ۲۴/=

۱۱۔ ارض القرآن ج ۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ ۱۸/=

۱۲۔ خیام۔ خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ ۴۵/=

۱۳۔ عربوں کی جہاز رانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ ۱۵/=

۱۴۔ عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) ۴۹/=

۱۵۔ نقوش سلیمانی۔ سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی) ۴۲/=

۱۶۔ یاد رفتگان۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات ۳۳/=

۱۷۔ مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ ۳۳/=

۱۸۔ مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ ۲۹/=

۱۹۔ مقالات سلیمان (۳) مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) ۲۹/=

۲۰۔ برید فرنگ۔ سید صاحبؒ کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔ ۲۰/=

۲۱۔ دروس الادب حصہ اول و دوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے ۴/= ۶/=

"منیجر"